معہد الصدیق للدراسات الاسلامیۃ کا ترجمان

سہ ماہی

الصدیق

صوابی

جلد ۱، شمارہ ۲ ربیع الثانی تا جمادی الثانی ۱۴۳۸ھ جنوری تا مارچ ۲۰۱۷ء

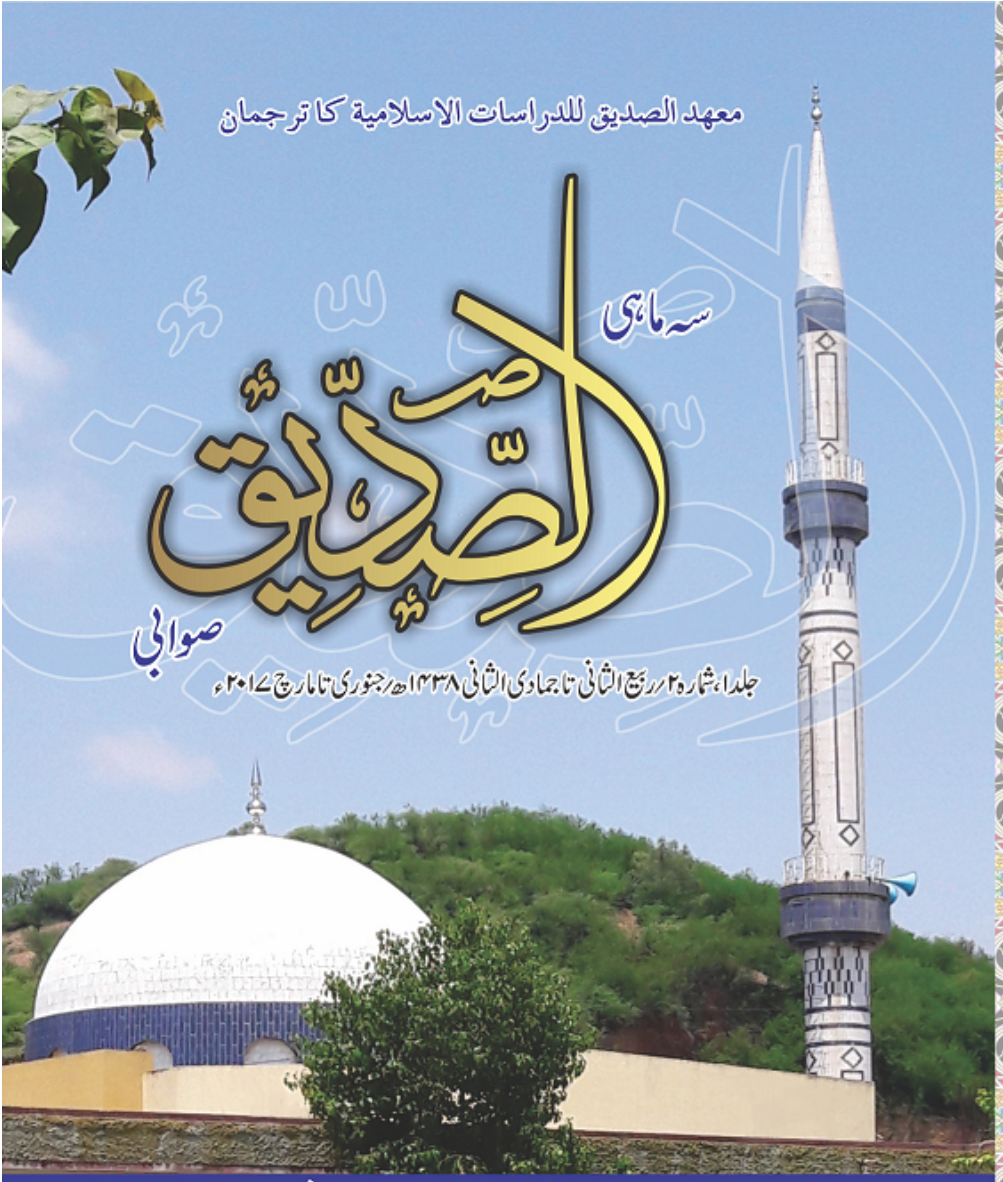

دارالصدیق لنشر البحوث الاسلامیۃ والعلمیۃ بام خیل صوابی k.p.k

تحقیق میں ندرت اور تنوع کا حامل علمی، تحقیقی اور اصلاحی مجلّہ

سہ ماہی الصدیق صوابی

بدعاء
پیر طریقت شیخ الحدیث
مولانا شیر اسلم خان قدس سرہ

جلد ۱، شمارہ ۲ / ربیع الثانی تا جمادی الثانی ۱۴۳۸ھ / جنوری تا مارچ ۲۰۱۷ء

زرتعاون.... فی شمارہ: ۸۰ روپے

زیر سرپرستی
حضرت مولانا عبدالحئی بادشاہ صاحب
حضرت مولانا عبدالحئی بادشاہ صاحب
مدیر مسئول
حضرت مولانا عبدالروف بادشاہ
مدیر
منفعت احمد
معاون مدیر
محمد اسلام حقانی
منتظم
مولانا عبدالجلیل بادشاہ
مجلس ادارت
ڈاکٹر حافظ محمد بادشاہ — ڈاکٹر جنید اکبر
مولانا مفتی سجاد الحجابی — مفتی ثناء اللہ
مولانا محمد کامران ہوتی
قانونی مشیر
مولانا محمد وجیہ اللہ ایڈوکیٹ (اسلام آباد)

دفتر سہ ماہی الصدیق
معہد الصدیق للدراسات الاسلامیۃ
بام خیل، صوابی، خیبر پختونخوا
alsiddiq2016@gmail.com
0313-9803280 / 0345-9506009

فہرست مضامین

نعت رسول مقبول	علامہ سید سلیمان ندویؒ	۲
دینی اداروں میں ربط وتعلق کی ضرورت	مدیر	۳
زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے	مولانا عبدالروف بادشاہ	۸
اعتدال مسلک علمائے دیوبند کی خصوصیت	شیخ سلیم اللہ خانؒ	۹
سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تنقیدی اسلوب	ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	۱۶
علوم اسلامی میں نحو کا مقام ومرتبہ	مولانا سجاد الحجابی	۲۴
گستاخ رسول کی توبہ اور ائمہ کے اقوال کا محاکمہ	مفتی ثناء اللہ رحمانی	۲۹
ٹرمپ کی کامیابی اور اسلامی جماعتوں کا لائحہ عمل	ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری	۴۱
اسلام اور جمہوریت نظریاتی اور عملی پہلو	مولانا محمد کامران ہوتی	۴۵
علماء کا مکان بدلنے سے مقام کیوں بدل جاتا ہے؟	ڈاکٹر سید خالد جامعی	۵۳
علم مقاصد شریعت ایک تعارف ایک جائزہ	مولانا مدثر جمال تونسوی	۶۶
ہم نے دیکھا تھا ایک فناء فی اللہ	مولانا سید حبیب اللہ حقانی	۷۹
تہذیب جدید کا چیلنج	مولانا علی عمران	۸۴
پر ہے مئے خون رنگ سے ہر شیشہ حلب کا	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۸۹
دینی علوم کی ڈیجیٹالائزیشن کی تحریک	مفتی محمد یاسر نعمانی	۹۳
عفو ودرگزر اتفاق واتحاد کے لیے اہم ضرورت	مولانا عبدالروف بادشاہ	۱۰۱
غریبوں کی بے بسی امیروں کی بے حسی	مولانا محمد اسلام حقانی	۱۰۶
حضورؐ کی تاریخ وفات کا ایک تحقیقی جائزہ	مفتی صدام مارتونگی	۱۱۹
واقعہ طاعون (وبا) عمواس ایک تحقیقی جائزہ	مفتی فضل وہاب بنوری	۱۲۲
آپ کے سوال کا جواب	دارالافتاء	۱۲۶
احوال وکوائف	مولانا برہان الدین	۱۲۷
کتاب شناسی	مبصر کے قلم سے	۱۲۹

ادارے کا مضمون نگار حضرات کے تمام آراء وافکار سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

نعت شریف

عشق نبوی درد معاصی کی دوا ہے
ظلمت کدہ دہر میں وہ شمع ہدی ہے
احمد سے پتہ ذات احد کا جو ملا ہے
مصنوع سے صانع کا پتہ سب کو چلا ہے
پڑھتا ہے درود آپ ہی تجھ پر ترا خالق
تصویر پہ خود اپنی مصور بھی فدا ہے
بندہ کی محبت سے ہے آقا کی محبت
جو پیرو احمد ہے وہ محبوب خدا ہے
آمد تری اے ابر کرم رونق عالم
تیرے ہی لئے گلشن ہستی یہ بنا ہے
فردوس وجہنم تری تخلیق سے قائم
یہ فرق بد و نیک ترے دم سے ہوا ہے
فرمان دو عالم تری توقیع سے نافذ
تیری ہی شفاعت پہ رحیمی کی بنا ہے
لے جائے گی منزل سے بہت دور بشر کو
جو جادہ سفر کا ترے جادے سے جدا ہے

دینی اداروں میں ربط وتعلق کی ضرورت

دل، جگر، کان، آنکھ، دماغ اور دیگر جسمانی اعضاء کی اہمیت وافادیت سے ہم بخوبی واقف ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی صحیح وسالم نہ ہوتو انسانی زندگی کس حد تک مجبور، بے بس اور لاچار ہوجاتی ہے گو کہ ان اعضاء کے کام الگ الگ ہیں، تاہم ان میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے، جس کے بغیر انسانی زندگی کا تصور محال ہے، مثلاً سر میں درد ہوتو دوا کے لیے پاؤں چل کر جاتے ہیں، آنکھ آنسو بہاتی ہے، زبان اُسے بیان کرتی ہے، دل ودماغ اسے محسوس کرتے ہیں، ہاتھ دوا پلانے میں مددگار ہوتے ہیں، اگر ان اعضاء وجوارح میں مقابلہ آرائی شروع ہوجائے کہ کون قیمتی، کون اعلی، کون بہتر اور کون افضل ہے؟ تو ظاہر بات ہے کہ جسم میں فساد پھوٹ پڑے گا اور پھر ایسے جسم کا خدا ہی حافظ!

اس جسم کے بے شمار تقاضے ہیں، مثلاً غذا، پانی، ہوا، نیند، راحت اور سکون وغیرہ اگر انسانی جسم کے یہ تقاضے بروقت پورے نہ ہوں تو انسانی زندگی کی نشو ونما، قیام اور بقاء خطرے میں پڑ جائے، ٹھیک اسی طرح اسلام کے بھی بیشمار تقاضے ہیں، مثلاً مساجد، مدارس، خانقاہ اور دارالقضاء کی تعمیر، توسیع اور ان کے انتظامات وغیرہ تاکہ طاغوت سے مکمل طور پر بچا جاسکے، قرآن مجید، احادیث مبارکہ اور دیگر دینی کتابوں کی طباعت واشاعت، مسلمانوں کے سماجی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لیے مساعی، دینی واسلامی تعلیمات سے دور مسلمانوں میں ایمان ویقین اور اعمالِ صالحہ کی بنیادی محنت، غیر مسلموں تک ان کی اپنی مادری زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی تدوین واشاعت، وغیرہ۔

اللہ کا شکر ہے کہ ان سارے امور وتقاضوں کو امتِ مسلمہ کے بے شمار افراد، تنظیمیں، تحریکیں، جماعتیں، حلقے اور گروہ جزوی طور پر انجام دے رہے ہیں، چنانچہ ان میں سے کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ ان میں سے ہر ہر کام اور ہر ہر تقاضے کو کما حقہ پوری طرح انجام دیے جاسکیں تاہم دین کی حفاظت، نشر واشاعت، مسلمانوں میں نیکیوں اور اچھائیوں کا ذوق وشوق، برائیوں وگناہوں سے نفرت وبیزاری کا رجحان پیدا کرنے کے سلسلہ میں جو جدوجہد اور کوششیں جاری ہیں خواہ کسی بھی شکل وصورت میں ہوں ان کی ضرورت وافادیت میں کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ ان کی اہمیت مسلّم ہے، اسی کے ساتھ اس سلسلے میں ہونے والے کاموں کو اگر دیکھا جائے تو ان میں بظاہر نہ یکسانیت ہے نہ ہی یگانگت بلکہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے، ہر ایک کا انداز بالکل جداگانہ، ہر ایک

کے طریقہ کار کا رنگ ڈھنگ بالکل علیحدہ، ہر ایک کے اپنے اصول، ضوابط اور مستقل نظام ہے، ایسی صورت میں قابل غور بات یہ ہے کہ دینی مراکز ومجالس، تحریکوں وتنظیموں اور اداروں میں باہمی ربط وتعلق اور دینی کام کرنے والوں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ طرز عمل اور رویہ کیسا ہونا چاہیے؟

یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ قرآن پاک کی جن آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری کے بلند مقاصد واغراض کو بیان کیا گیا ہے ان میں بنیادی طور پر تعلیم، تبلیغ اور تزکیہ ہی کا ذکر کیا گیا ہے، ان کاموں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت میں سے ہونا اس بات کو بتلا رہا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں، جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اصل مقصود یہی ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرے کی حیثیت ضمنی اور ثانوی ہے، یہ اہم ہے اور یہ غیر اہم، مرتبہ کے اعتبار سے اس کا درجہ زیادہ ہے اور اس کا کم اور یہ فیصلہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ ایک کو افضل دوسرے کو مفضول قرار دیا جاسکے، ایک کو دوسرے کے مقابلہ پر ترجیح کا ضابطہ ایسی چیزوں میں ہوتا ہے جو ایک ہی نوع کی ہوں بصورت دیگر جب وہ انواع کے اعتبار سے الگ الگ ہوں تو پھر ان میں تفاضل وترجیح کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

تفاضل ایک نوع میں ہوتا ہے نہ کہ انواع میں، کوئی اگر سوال کرے کہ آنکھ بہتر ہے یا کان، ناک بہتر ہے یا زبان، ہاتھ بہتر ہے یا پاؤں، تو جواب دیا جائے گا کہ ہر ایک ان میں ضروری ہے، ان میں تفاضل کا سوال ہی غلط ہے، کیونکہ یہ الگ الگ نوع ہیں، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں آنکھوں میں جو زیادہ دیکھتی ہے وہ افضل ہے اور دونوں کانوں میں جو زیادہ سنتا ہے وہ افضل ہے، اس مثال سے اب یہ سوال واضح ہوجاتا ہے کہ تعلیم، تبلیغ اور تزکیہ میں کس کی ضرورت زیادہ ہے، لیکن یہ سوال مناسب نہیں، کیونکہ یہ انواع مختلفہ ہیں، انواع مختلفہ میں تفاضل نہیں ہوتا، لہٰذا ہر ایک کی ضرورت ہے، تبلیغ بھی ضروری، تعلیم بھی ضروری، تزکیہ بھی ضروری، جب معاملہ یہ ہے تو پھر تینوں ہی کام مقاصد میں سے ہیں اور اپنی اپنی جگہ اہم اور ضروری ہیں کسی ایک سے بھی تغافل وپہلوتہی نہ ہونی چاہیے، نہ کسی کو معمولی وگھٹیا سمجھنا چاہیے، سبھی شعبوں کی آبیاری ہونی چاہیے، جب تک یہ تینوں کام نہ انجام دیے جائیں اور سعی وکوشش کرکے ان کو زندہ نہ کیا جائے تب تک کار نبوت کی پورے طور پر نہ تو انجام دہی ہوگی، نہ ہی یہ امت اپنے فرائض وذمہ داریوں سے عہدہ برآں ہوگی، بلکہ جس شعبہ سے تغافل ہوگا اس پر مؤاخذہ ہوگا۔

یہ تینوں اگرچہ دیکھنے کے اعتبار سے الگ الگ ہیں، لیکن حقیقت کے لحاظ سے آپس میں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط وجڑے ہوئے ہیں کہ انسانی زندگی میں کمال وخوبی تبھی آئے گی جب یہ تینوں کام سرانجام ہوں، کسی ایک سے بھی پہلوتہی کرلی جائے تو نقص وکمی کا ہونا لازمی ہے کیونکہ تبلیغ وتعلیم سے ایمان وعقیدہ، علم وعمل وجود میں آتا ہے اور تزکیہ سے اخلاص واحسان اور اعمال میں قبولیت پیدا ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ ان کے بغیر انسان کی کامیابی وفلاح کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، جب ان کا وجود تبلیغ، تعلیم اور تزکیہ سے ہے تو یہ تینوں ہی ضروری ہوئے، ایسی صورت میں ان میں ہر ایک کے بارے میں یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ نافع اور مفید ہے لیکن کسی ایک کو کافی نہیں کہا جاسکتا، کافی اسی وقت ہوگا جب تینوں کام سرانجام دیے جائیں، اس لیے اپنی حیثیت ووسعت کے موافق جس کو جس

کام سے مناسبت ہو اس میں تعاون کرنا چاہیے، جو جس شعبہ میں لگا ہوا ہے وہ دین کا کام کر رہا ہے، دین کا کام کرنے والے باہم ایک دوسرے کے رفیق و معاون ہیں، لہٰذا آپس میں ہمدردی کا معاملہ، خیر خواہی کا جذبہ، ایک دوسرے کے دکھ درد میں باہمی نصرت و مدد اور ایک دوسرے کی خدمات کو سراہنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی ترقی سے خوش بھی ہونا چاہیے۔

ہر انسان کے جملہ اعضاء الگ الگ خدمات انجام دے رہے ہیں مگر کوئی انسان اپنے کسی عضو کو حقیر نہیں سمجھتا اور نہ ان کی خدمات کے اندر تفاضل و تقابل کرتا ہے اور نہ ایک دوسرے کا حریف و فریق بناتا ہے، اسی طرح دین ایک جسم ہے، اس کے اجزاء الگ الگ ہیں کوئی تعلیم کے لیے مدرسہ میں لگ گیا، کوئی دعوت و تبلیغ میں لگ گیا، کوئی تزکیہ نفس کے لیے خانقاہ میں لگ گیا، کوئی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد میں نکل گیا، پس دین کے ہر جزء کے خادموں کو آپس میں ایک دوسرے کو حقیر سمجھنے کا حق کیونکر؟ اور آپس میں تفاضل و تقابل اور فریق و حریف بنانا کیسے صحیح ہوگا؟

سردست دینی تحریکوں، اداروں اور ان سے وابستہ افراد میں باہمی ربط و تعلق کی جو نوعیت ہے وہ بڑی عجیب و غریب ہے، آپس میں مخلصانہ و ہمدردانہ تعلق و تفاضل کا معاملہ، ایک دوسرے سے رفاقت و تعاون کے بجائے رقابت و غیریت، خیر خواہی و خیر اندیشی کی بجائے بدخواہی و بد اندیشی، خود جس کام میں ہے وہ تو دین کا کام ہے اور بقیہ جو دینی محنت اور کام ہو رہے ہیں وہ فضول و بے کار، یہ انداز فکر کس قدر خطرناک ہے؟ آج جب کہ باطل مختلف شکلوں اور حربوں کے ساتھ صرف حملہ آور ہی نہیں بلکہ سب کے سب اسلام دشمنی کے متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مِن كُلِّ حَدَبٍ يَّنسِلُوْن کا مصداق ہے، ایسے نازک موقع پر دینی کام کرنے والوں میں اس طرح کی صورتحال کتنی افسوس ناک و تشویشناک ہے؟ ضرورت ہے کہ آپس میں محبت و الفت کا ماحول رکھا جائے تاکہ تعلقات خوشگوار رہیں، کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو صبر و تحمل و ایثار سے کام لیا جائے، افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کر کے ایک دوسرے کی طرف سے دلوں کو صاف رکھا جائے، حدود میں رہ کر دوری کو قربت سے بدلا جائے، تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى کی فضاء قائم کی جائے۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ہم جس دینی سلسلہ سے وابستہ ہیں اس کے علاوہ اور دینی کام اور دینی سلسلے بھی ہیں، مثلاً دینی مدارس و مکاتب اور دوسرے دینی ادارے ہیں ان سب کی دل سے قدر و عزت کی جائے اور ان کے ساتھ ہمارے دلوں میں ہمدردی اور خیر خواہی اور اللہ کے ان بندوں کی پوری عظمت ہو، جو اخلاص کے ساتھ دین کے ان سلسلوں میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی کوششیں ان کے لیے صرف کر رہے ہیں، اگر ہم نے صرف اپنے کام کو دینی کام سمجھا اور دوسرے دینی کاموں اور ان کے چلانے والوں کے متعلق ہمارے دلوں میں خدانخواستہ رقابت والے جذبات پیدا ہوئے تو یہ ہماری بڑی گمراہی اور بدنصیبی ہوگی بلکہ خدمت دین کے ضمن میں یہ ہماری بے دینی ہوگی، خاص کر علماء ربانی اور اہل اللہ کا ہم اپنے کو خادم بلکہ کفش بردار سمجھیں اور ان کی صحبت سے استفادہ کے لیے گاہے بگاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کریں اور ان سے تعلق بڑھانے کو اپنی حاجت سمجھیں اور جو دوسرے دینی کام، دینی تحریکیں اور دینی ادارے ہیں ان کو رقیب و حریف نہ سمجھا جائے، بلکہ ان سب کی قدر کی جائے اور ان کے لیے اور زیادہ مفید ہونے اور پھلنے پھولنے کی

اورغلطیوں سے محفوظ رہنے کی اللہ تعالیٰ سے دعائیں کی جائیں، ایسا نہ ہو کہ بس دین کو صرف ہماری جماعت کی ضرورت ہے اور میں جو کام کر رہا ہوں فقط یہی اصل ضرورت ہے، نہیں! بلکہ دین کو دراصل سب کاموں کی ضرورت ہے، اس زمانے میں دین کی ضرورتیں اتنی بڑھ گئی ہیں اور اتنی پھیلی ہوئی ہیں کہ کوئی ادارہ، کوئی سلسلہ، کوئی جماعت اور کوئی تحریک ان سب ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی، ذرا سوچئے! ہمارے ہزاروں دینی ادارے، خانقاہیں اور دینی جماعتیں دین کے لیے اور مسلمانوں کے لیے جو کچھ کر رہی ہیں اگر یہ سب کرنا چھوڑ دیں تو کتنی بڑی کمی ہو جائے گی اور کیسا اندھیرا چھا جائے گا کیا پھر کوئی جماعت ان سب کاموں کو سنبھال سکے گی؟

لہٰذا دوسری جماعتوں اور دوسرے اداروں کی خدمات کی قدر اور اعتراف نہ کرنا اور کسی معمولی سے اختلاف کی وجہ سے بس ان کو تنقید کا نشانہ بنائے رکھنا، یہ اس وقت کی بڑی مہلک بیماری ہے اور شیطان کو اس معاملہ میں بڑی کامیابی حاصل ہو رہی ہے کہ اس نے جماعتوں اور پارٹیوں کا یہی مزاج بنا کر امت کے کارکن طبقہ کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کر دیا ہے، اب ایک کے ذریعہ دوسروں کی برائیاں اور غلطیاں تو منظر عام پر آ رہی ہیں لیکن خوبیوں کا کہیں چرچا نہیں، بہرحال ہمارا اسلامی نقطہ نظر بھی یہی ہے کہ ہم سب دینی کاموں کی قدر کریں اور اگر اپنی مشغولیت کی وجہ سے دینی کام خود نہیں کر سکتے تو ان کے کرنے والوں کا احسان مانیں، آج اگر کوئی فرد، ادارہ یا جماعت دین کے کسی مخصوص شعبے سے وابستہ ہے اور اپنی مخلصانہ صوابدید کے مطابق کسی طرز پر کام کر رہی ہے تو ہمارا ان سے کوئی اختلاف نہ ہونا چاہیے، بلکہ ہمیں ان کے کام کا اعتراف کرنا چاہیے اور ان سے تعلقات بڑھانے چاہئیں، اس لیے کہ وہ دین کے بعض اہم شعبوں کو سنبھالے ہوئے ہیں اور اس طرح انہوں نے ہم کو یہ موقع فراہم کیا ہے کہ ہم دوسرے کاموں کی طرف سے مطمئن ویکسو ہو کر اپنا کام کریں یہ ہمارے اکابر و اسلاف کا شیوہ اور طرز عمل رہا ہے۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ امت میں طبقات کا اتنا اختلاف ہے، اذہان کی اتنی تفاوت ہے اور حالات ایسے مختلف ہیں کہ کوئی تحریک یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ تمام طبقات کو متاثر کر سکے اور ان کی تسکین کا سامان مہیا کر سکے اور ان کی استعداد کے مطابق دینی غذا فراہم ہو، اس لیے کہ کوئی ذہن تقریر سے متاثر ہوتا ہے، کسی پر لٹریچر اثر انداز ہوتا ہے اور کوئی دوسرے ذریعہ سے متاثر کیا جا سکتا ہے، اس طرح ایک واحد طریقہ سے ہر جگہ، ہر حالت میں کامیابی مشکل ہے، اس حقیقت کو سمجھنے اور اس کے مطابق چلنے میں لوگوں سے بڑی غلطیاں ہوتی ہیں، بہت سے لوگ قابل قدر اور بڑے مخلص ہیں لیکن ان لوگوں کا اس وقت تک دل خوش نہیں ہوتا جب تک کہ ہر شخص انہیں کے مخصوص طرز پر کام نہ کرے اور سب ایک ہی کام نہ کرنے لگیں، حالانکہ عمومی اور انقلابی تحریکوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا، وہاں ہر چیز اس کے صحیح مقام پر رکھی جاتی ہے اور ٹھیک چوکھٹے پر بٹھائی جاتی ہے، ہر شخص سے وہی کام لیا جاتا ہے جس کا وہ زیادہ اہل ہے اور اس میں وہ دوسروں سے ممتاز ہو، جس کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہو، ہم کو تو دوسری دینی کوششوں اور ان کے ذمہ داروں کا شکر گزار ہونا چاہیے، کہ انہوں نے بہت سے لوگوں کو سنبھال رکھا ہے، جو ہماری گرفت میں نہیں آ سکتے تھے، یہ اللہ کی طرف سے انتظام سمجھنا چاہیے کہ کچھ لوگ اس راستہ میں دین تک آ جائیں اور کچھ اس راستہ سے آ جائیں، لہٰذا دینی کام کرنے والوں میں باہمی ربط و تعلق، انسیت و قربت کے لیے درج ذیل امور کا اہتمام ان شاء اللہ مفید ہوگا۔

☆ ایک دوسرے کے لیے دعاؤں کا اہتمام اور آپس میں ایک دوسرے سے اسی کی گزارش کرنا، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر شخص دوسرے کو اپنے لیے دعا گو سمجھے گا جس سے باہمی انسیت پیدا ہوگی، اور آپس میں بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کے ازالہ اور باہمی محبت وقربت کا ذریعہ ہوگی۔

☆ جس میں کمزوریاں وغلطیاں نظر آئیں، ان پر نہ تو تنقید وتبصرہ کیا جائے، نہ ہی اپنی مجالس ومحافل کا اس کو موضوع بحث بنایا جائے نہ ہی اس کی تشہیر کی جائے، بلکہ خیر خواہی وہمدردی کے جذبہ کے ساتھ اس کی اصلاح کی فکر وکوشش کی جائے، اسی کے ساتھ جن لوگوں سے اصلاح ہوسکتی ہے مناسب عنوان سے ان کو متوجہ کر دیا جائے۔

☆ آپس میں حسب موقع ملاقات پر ایک دوسرے کی کارگزاری اور کام کی تفصیلات معلوم کر کے خوشی ومسرت کا اظہار کیا جائے اور اگر کوئی مشکل مواقع درپیش ہو تو حتی الامکان اس کے حل کرنے کی مناسب تدابیر بطور مشورہ بتادی جائے۔

☆ اپنے اپنے علاقہ پر دینی اعتبار سے نظر رکھی جائے، جہاں جس نوع کے کام کی ضرورت محسوس ہو، اس کے لائق ومناسب جو افراد ہو، ان کو اس طرف متوجہ کر کے اپنی حیثیت وبساط کے موافق ان کا تعاون ونصرت کی جائے۔

☆ اپنے اپنے کام کا تعارف اور اس کے لیے ترغیب دی جائے، اس طرح کہ دوسرے کاموں کے مقابلہ میں نہ تفاخر اور ہی کسی کی تحقیر ہو، بلکہ حسب موقع دوسرے کاموں کی بھی اہمیت وضرورت کا اعتراف اور کشادہ دلی کا ثبوت ہو۔

الغرض دینی تنظیموں، تحریکوں اور جماعتوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہے، اتحاد کے لیے ضروری ہے کہ عصبیت سے پوری طرح بچا جائے، علاقہ، نسل، رنگ، ملک، قوم، وطن، زبان، خاندان، حسب ونسب وغیرہ کی بنیاد پر گروہ بندی ہی عصبیت ہے، اگر کسی فرد یا گروہ کی کسی تقریر، تحریر یا عمل سے عصبیت کی بو آئے تو اسے فوری طور پر روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے کہ ایک آدمی کی شورش بھی بڑی چیز ہے، دیا سلائی کی ایک سلائی پوری دنیا کو جلا سکتی ہے، ٹھیک اسی طرح ایک انسان بھی پوری دنیا میں فتنہ برپا کر سکتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ عصبیت سے پوری طرح بچا جائے نیز ہر حال میں اتحاد کو قائم ودائم رکھا جائے، عصبیت کو چھوڑے بغیر امت میں اتحاد کی آرزو اور تمنا رکھنا ایسا ہی فضول ہے، جیسا کہ مشرق کی سمت میں سفر کرنا اور مغرب میں پہنچنے کے خواب دیکھنا، اتحاد ترقی کی اولین شرط ہے، اور نا اتفاقی بربادی کا پہلا زینہ، متحد رہیں گے تو زمانہ ٹھوکر میں ہوگا اور منتشر ہوں گے تو زمانہ کی ٹھوکر میں ہم ہونگے، یہی تاریخ کا سب سے بڑا سبق ہے مگر تاریخ کا یہی سب سے بڑا سبق ہم نے بھلا رکھا ہے۔

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا کام بنے

مولانا عبدالرؤف بادشاہ
مدیر مسئول

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

داعی اتحاد امت شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان قدس سرہ کا سانحہ ارتحال

۱۶ جنوری ۲۱۰۷ کو اتحاد ملت کے علمبردار، اتحاد مدارس دینیہ پاکستان کے سرپرست اور وفاق المدارس کے صدر شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان قدس سرہ کی رحلت کی المناک خبر سن کر نہایت افسوس اور صدمہ پہنچا۔

اتحاد امت کا یہ داعی اور مدارس دینیہ کا روح رواں آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہے، شیخ الحدیثؒ ملت اسلامیہ کے لیے دیکھے جانے والے پاکیزہ خوابوں کے ساتھ خالق حقیقی سے جا ملے، یہ امت مسلمہ کے لیے بالعموم اور پاکستانی معاشرے نیز مدارس دینیہ کے لیے بالخصوص ایک عظیم نقصان ہے، جس کی فوری تلافی ممکن نہیں، خداوند کریم مدارس دینیہ کی قیادت کو اپنے قائد کی متعین کردہ راہوں پر چلتے ہوئے ان کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے، شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحبؒ ملت اسلامیہ میں کسی تعارف کے محتاج نہ تھے، ان کے لیے تھے کا لفظ لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے، تاہم بعض افراد کا اس دار فناء سے چلے جانا انسانی معاشرے پر بہت دوررس نتائج کا حامل ہوتا ہے، شیخ صاحب مرحوم کا شمار بھی ایسے ہی چند افراد میں ہوتا تھا، جن کا وجود معاشرے کے لیے خیر و برکت کا باعث تھا، حضرت شیخ مرحوم کو اللہ تعالی نے ایک دل دردمند عطا فرمایا تھا اور آپ کا قلب ہر وقت اسلام اور عالم اسلام کے درد سے معمور رہتا تھا اسی بناء پر دین کے خلاف جتنے فتنے اٹھتے تھے آپ ہمہ وقت اس کے قلع وقمع کے لیے بے چین رہتے، وفاق المدارس العربیہ کے صدر ہونے کے ساتھ تمام مکاتب فکر کی دینی مدارس کی تنظیم اتحاد مدارس دینیہ کی سرپرستی بھی فرماتے تھے اور ملک بھر کے تمام دینی اداروں اور علماء کے ساتھ تعاون کیا کرتے تھے، معہد الصدیق اور ادارہ حضرت شیخ صاحب مرحوم کے سانحہ ارتحال میں جامعہ فاروقیہ، مرحوم کے تلامذہ اور متوسلین، صاحبزادگان اور دیگر اقارب کے ساتھ اس صدمہ میں برابر کا شریک اور حضرت شیخ الحدیث کے رفع درجات کا متمنی ہے اور خود کو تعزیت کا مستحق سمجھتا ہے اللہ کریم مرحوم کے پسماندگان و جملہ متعلقین کو اس صدمہ عظمیٰ کے تحمل و برداشت اور ان کے عظیم مشن کی تکمیل اور ذمہ داریوں کے نباہنے کی توفیق دے۔

عجب قیامت کا حادثہ ہے، آستیں نہیں ہے
زمین کی رونق چلی گئی ہے، افق پہ مہر مبین نہیں

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ تعالیٰ

اعتدال

علمائے دیوبند کے مسلک ومزاج کی خصوصیت

برصغیر میں اسلامی تاریخ کے عروج وزوال کی داستان بہت طویل ہے، یہاں صدیوں تک مسلمان بادشاہوں کی حکم رانی رہی اور ہند کے تمام خطوں میں اسلامی تہذیب وثقافت اور اسلامی حکومت وقیادت کا جھنڈا لہراتا رہا، دوسری قوموں اور دوسرے مذاہب کی حیثیت یہاں ثانوی درجے کی ضرور رہی، لیکن قیادت وسیادت اور حکومت وسلطنت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی، یہاں تک کہ تجارت کی غرض سے برصغیر میں داخل ہونے والے انگریزوں نے اپنے وسائل اور اپنی مکاری وعیاری سے طویل جدوجہد کے بعد یہاں قبضہ کرلیا اور برصغیر کے مزاج زندگی اور نظام تعلیم وتربیت کو بدلنے اور اسے انگریزی اور فرنگی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ٹھوس اور طویل المیعاد منصوبہ بندی کی۔

برصغیر سے اسلامی تہذیب مٹانے کی کوشش

یہ برصغیر میں اسلامی تہذیب وثقافت، اسلامی تعلیم وتربیت اور مسلمانوں کے امتیازی تشخص کو مٹانے اور ختم کرنے اور مسلمانوں کی نئی نسل کو فرنگی مزاج میں رنگنے کا سوچا سمجھا خطرناک منصوبہ تھا، تب اللہ کے چند نیک اور مخلص بندوں نے دیوبند نامی بستی میں دفاعی لائحہ عمل کے طور پر ہند میں اسلامی تشخص اور اسلامی نظام تعلیم وتربیت کو برقرار رکھنے کے لیے بے سروسامانی کے عالم میں خالص اللہ پر توکل کرتے ہوئے ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی، یہ مدرسہ جو انار کے درخت کے نیچے ۱۲۶۸ھ میں ایک استاذ اور ایک شاگرد سے شروع ہوا تھا، بعد میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانا اور پہچانا گیا، اس کی شاخیں اور اس کے نہج پر قائم ہونے والے مدارس کا پورے برصغیر میں ایک جال بچھتا چلا گیا، فرنگی منصوبہ بندی کے نتائج سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے حفاظتی اور دفاعی جال! پھر ان مدارس میں تعلیم وتربیت حاصل کرنے اور یہاں کے رنگ میں رنگنے والوں نے برصغیر میں مسلمانوں کے امتیازی تشخص کو برقرار رکھنے کا فریضہ تو انجام دیا، تاہم انہوں نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ فرنگی ملکوں میں جاکر ان کی تہذیب وکلچر پر یلغار کا اقدام بھی کیا، تب سے ان مدارس کو اغیار اپنی راہ کا کانٹا اور اپنی منصوبہ بندی کی کامیابی کے لیے سب سے بڑی روکاٹ سمجھتے ہیں اور بجا سمجھتے ہیں۔

علمائے دیوبند کی خصوصیات

دارالعلوم دیوبند اور اس عظیم ادارے کی طرف منسوب اکابر علمائے دیوبند کی بہت سی خصوصیات تھیں، اخلاص وللّٰہیت، دیانت وامانت، اسلامی علوم میں پختگی ومہارت، ان کی ترویج واشاعت، خودداری واستغنا، حق کی حمایت، باطل کی تردید، اسلاف پر اعتماد، اتباع سنت، یہ سب صفات ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں، لیکن مجھے آج ان کی جس صفت اور جس خصوصیت کو ذکر کرنا ہے وہ اعتدال ہے، علمائے دیوبند کے مسلک ومزاج میں اعتدال وہ بنیادی عنصر وخصوصیت ہے جو انہیں افراط وتفریط سے بچا کر ٹھیک اسی راستے تک لے جاتی ہے جو ما أنا عليه وأصحابي کا مصداق ہے اور جس پر چلنے والے اہل سنت والجماعت کہلاتے ہیں، اعتدال کی یہ صفت ان کی زندگی کے ہر ہر شعبے میں جھلکتی ہے۔

علماء دیوبند افراط وتفریط سے دور

راہ اعتدال پر چلنے والوں کے لیے ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ افراط والے انہیں تفریط میں مبتلا سمجھتے ہیں اور اہل تفریط انہیں افراط کے زمرے میں شمار کرتے ہیں، علمائے دیوبند کے ساتھ بھی ایسا ہوا اور ہو رہا ہے، مثلاً علمائے دیوبند، قرآن وحدیث پر ایمان کامل اور عمل صالح کے ساتھ اسلاف پر بھرپور اعتماد کرتے ہیں اور قرآن وحدیث کی تشریح میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے کے بجائے ان کے اقوال وتشریحات کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں، لیکن اس اعتماد اور عقیدت میں وہ اس قدر غلو نہیں کرتے کہ وہ شخصیت پرستی یا عبادت کے رتبے کو چھو لے، بلکہ یہ اعتماد اور عقیدت، فرق مراتب کو ملحوظ رکھ کر، اعتدال کی حدود کے اندر ہی اندر رہتی ہے۔

حسام الحرمین اور الدیوبندیہ

افراط تفریط میں مبتلا دونوں فریقوں نے علمائے دیوبند کے خلاف پروپیگنڈہ کیا، افراط والوں نے انہیں اہل تفریط میں شمار کیا اور تفریط والوں نے ان پر افراط کا الزام لگایا، چنانچہ حسام الحرمین نامی ایک کتاب لکھی گئی جس میں علمائے دیوبند پر گستاخ رسول ہونے کا الزام عائد کیا گیا اور پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ لوگ اولیاء اللہ کو نہیں مانتے، ان کے دلوں میں اولیاء کے لیے عقیدت واحترام کے جذبات نہیں ہیں، اس کے بالکل برعکس ایک دوسرے فریق کی طرف سے علمائے دیوبند کے خلاف کتابوں کا سلسلہ چل نکلا، جن میں باور کرایا گیا کہ یہ قبر پرست اور اسلاف واکابر کی شخصیت پرستی میں مبتلا جماعت ہے، الدیوبندیہ نامی کتاب اسی پروپیگنڈہ پر مشتمل ہے، لیکن الحمدللہ! علمائے دیوبند ادھر ہیں، نہ ادھر، نہ گستاخی کے مرتکب ہیں، نہ شخصیت پرستی میں مبتلا، بلکہ وہ درمیان کی راہ اعتدال کے راہی ہیں۔

علماء دیوبند اور جادہ اعتدال

اسلام کے بنیادی اہداف ومقاصد کے حصول کے لیے طریقہ کار اور لائحہ عمل اختیار کرنے میں بسا اوقات رائے کا اختلاف

ہوجاتا ہے، ایک فریق اپنے تجربات، اپنی بصیرت اور علم کی روشنی میں ان بنیادی اہداف ومقاصد کے حصول کے لیے جو طریقہ اختیار کرتا ہے، دوسرا فریق اس طریقہ کو مفید نہیں سمجھتا اور اس سے مختلف لائحہ عمل اختیار کرنے کو ترجیح دیتا ہے، رائے کا اس طرح کا اختلاف اکابر علمائے دیوبند میں بھی مختلف مواقع پر ہوا ہے، عموماً اس طرح کے اختلاف کے موقع پر جادہ اعتدال سے دونوں فریق ہٹ جاتے ہیں اور حالت یہ ہوجاتی ہے کہ فریق مخالف کی اچھائی بھی برائی نظر آنے لگتی ہے، جب کہ دوسری طرف اپنی جماعت کی شرعی قباحتوں کو بھی نظر انداز کرنے کا معمول بن جاتا ہے لیکن آفرین ہے اکابر علمائے دیوبند پر کہ انہوں نے رائے کے شدید اختلاف کے باوجود اعتدال کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

دوقومی نظریہ اور علماء کا باہمی اختلاف

ہندوستان کے مسلمانوں میں دو نظریے تقسیم ہند سے بہت پہلے سے چلے آرہے تھے، ایک یہ کہ مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کو ہندوستان میں دوسری اقوام کے ساتھ مل کر سیاسی وجدوجہد کرنی چاہیے، ورنہ اکثریت کے خلاف رہ کر کسی سعی وکوشش کا کامیاب وبارآور ہونا بڑا مشکل ہے، دوسرا نظریہ یہ تھا کہ ہندو ایک تنگ نظر قوم ہے، اس کے ساتھ اتحاد کر کے مسلم قوم کسی مقصد تک نہیں پہنچ سکتی، اس لیے مسلمانوں کو اپنی جدوجہد الگ اور مستقل کرنی چاہیے، اکابر علمائے دیوبند ان دونوں نظریوں میں مختلف رہے، دونوں طرف اکابر بھی تھے اور دلائل بھی تھے، مقصد دونوں کا ایک تھا، لیکن لائحہ عمل اور طریقہ کار میں رائے اختلاف تھا۔

جب آزادی کی تحریک اپنے انجام کے قریب پہنچ رہی تھی، تو تقسیم ہند کی تحریک نے بھی زور پکڑا، مسلم لیگ نے تقسیم کا پرچم اٹھایا تو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور ان کے ہم خیال علماء نے تقسیم ملک کی حمایت میں مسلم لیگ کی تائید کی، جنہیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی حمایت وتائید حاصل تھی دوسری طرف جمعیت علما ہند نے تقسیم ملک کو مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ضرر رساں باور کیا، اس لیے انہوں نے تقسیم کی مخالفت کی، ان علماء کی قیادت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دھلویؒ کر رہے تھے۔

یہاں سوال پاکستان کی مخالفت یا حمایت کا نہیں تھا، جیسا کہ پروپیگنڈائی شور وغوغا کے ذریعے باور کیا اور کرایا جارہا ہے، بلکہ سوال دراصل یہ تھا کہ آزادی کی کون سی صورت مسلمانوں کے لیے مستقبل میں مفید، بہتر اور کامیابی کی ضامن ہوگی؟ اس میں وحی تو کسی پر نازل نہیں ہورہی تھی، فیصلہ انسانی سوچ اور رائے ہی کو کرنا تھا اور انسانی رائے میں خطاء وصواب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔

اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے عقیدت واحترام

تقسیم کی حمایت کرنے والے یہ سمجھ رہے تھے کہ مغربی تہذیب سے نجات پانے، مسلمانوں کے اپنے اسلام پر عمل پیرا ہونے اور اپنی زندگیوں کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے کی واحد صورت یہی ہے کہ ملک کو تقسیم کر کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ خطہ زمین دے دیا جائے، جہاں وہ اپنے دین کو نافذ کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں آزاد ہوں، تقسیم کی مخالفت کرنے والوں کا کہنا تھا کہ انگریز سے

صرف آزادی حاصل کرو اور کچھ نہ کرالو، اگر اس سے بٹوارہ کرایا گیا تو وہ یقیناً مسلمانوں کے حق میں ڈنڈی مارے گا اور پھر ساری زندگی پچھتانا پڑے گا، لیکن رائے کے اس شدید اختلاف کے دور میں بھی دونوں طرف کے بزرگوں کے آپس کے اکرام واحترام اور عقیدت ومحبت کے یہ چند واقعات ملاحظہ ہوں، ایک مرتبہ حضرت مدنی رحمہ اللہ گرفتار ہوئے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ، اسارت کی خبر سن کر بہت غمگین ہوئے اور اس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

مجھے خیال نہیں تھا کہ مولانا مدنی سے مجھے اتنی محبت ہے، حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ مولانا مدنی تو اپنی خوشی سے گرفتار ہوئے ہیں تو حضرت تھانوی نے فرمایا آپ مجھے اس جملے سے تسلی دینا چاہتے ہیں، کیا حضرت حسین، یزید کے مقابلے میں اپنی خوشی سے نہیں گئے تھے؟ مگر آج تک کون ایسا شخص ہوگا جس کو اس حادثہ سے رنج نہ ہوا ہو(۱)

ایک بار حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ علیہ سے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

میں مولانا حسین احمد کو انکے سیاسی کاموں میں مخلص اور متدین سمجھتا ہوں، البتہ مجھے ان سے حجت (دلیل) کے ساتھ اختلاف ہے، اگر وہ اختلاف رفع ہوجائے تو میں ان کے ماتحت ایک ادنیٰ سپاہی بن کر کام کرنے کے لیے تیار ہوں(۲)

ایک اور موقع پر فرمایا: میں اپنی جماعت میں مفتی کفایت اللہ صاحب کے حسن تدبر کا اور مولانا حسین احمد صاحب کے جوش عمل کا معتقد ہوں، ایک مرتبہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمہ اللہ سے فرمایا:

ہمارے اکابر دیوبند کی بفضلہٖ تعالی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، چنانچہ شیخ مدنی کے دو خداداد خصوصی کمال ہیں، جو ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں، ایک تو مجاہدہ، جو کسی دوسرے میں اتنا نہیں ہے، دوسرے تواضع، چناں چہ سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے(۳)

ایک مرتبہ فرمایا:

مجھ کو اپنی موت پر بھی فکر تھی کہ بعد میں باطنی دنیا کی خدمت کرنے والا کون ہے؟ مگر حضرت مدنیؒ کو دیکھ کر تسلی ہو گئی کہ یہ دنیا ان سے زندہ رہے گی(۴)

حضرت مدنی اور تھانویؒ کے باہمی محبت

۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ، مفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ چلے گئے اور دارالعلوم دیوبند شدید بحران کا شکار ہوا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے سرپرست بھی تھے اور مجلس شوری کے رکن بھی، چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ ہی نے سرپرست کی حیثیت سے اس وقت کے مہتمم اور نائب مہتمم کو مشورہ دیا کہ حضرت مدنی کو دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس کا عہدہ سنبھالنے کے لیے لایا جائے، چنانچہ آپ کے مشورے پر عمل کیا گیا،

مجلس شوریٰ نے ایک تجویز منظور کی، اس میں حضرت مدنی کے لیے بلند کلمات تحریر کیے گئے اور ان سے یہ عہدہ سنبھالنے کی درخواست کی گئی، حضرت مدنیؒ نے کچھ شرطیں پیش کیں، وہ تمام شرطیں حضرت تھانوی اور مجلس شوریٰ نے منظور فرمائی اور اس طرح حضرت مدنیؒ نے دارالعلوم دیوبند میں آ کر اپنی شان دار اور وقیع تدریسی خدمات کا آغاز فرمایا۔

مولانا مدنیؒ کا حضرت تھانویؒ سے عقیدت

یہ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے چند واقعات تھے، اب دوسری طرف حضرت مدنی رحمہ اللہ کا ان کے ساتھ احترام وعقیدت کا حال ملاحظہ فرمائیں، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> واقعہ یہ ہے کہ یہ ناکارہ حضرت مولانا (تھانوی) دامت برکاتہم کا نہایت معتقد اور ان کی تعظیم واحترام کو نہایت ضروری سمجھتا ہے، ان کی قابلیت اور کمالات کے سامنے اتنی بھی نسبت نہیں رکھتا جو کہ طفلِ دبستان کو افلاطون سے ہو سکتی ہے میں مولانا کو اپنا مقتدی اور اپنے اکابرین میں سمجھتا ہوں (۵)

حضرت مدنی رحمہ اللہ ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم سے ہمارا سیاسی اختلاف ہے اور بہت زیادہ اختلاف ہے، مگر جزئیات اور فروع اور اسلامک لاء (جن کو سیاست سے تعلق نہیں ہے) ان میں ان کا قول قابل اعتماد ہوگا، مولانا موصوف کا اسلامی تفقہ اور علوم وفنون میں تمام عمر مصروف رہنا، ان کی تعلیم دینا، ان میں اعلی سے اعلی ڈگری حاصل کرنا، ان میں بے شمار مفید اور کارآمد تصانیف کر کے عالم اسلامی اور خلائق کو فیض یاب بنانا آفتاب کی طرح دنیا میں روشن ہے اور ہو چکا ہے (۶)

ایک مرتبہ حضرت مدنی رحمہ اللہ کے بھتیجے مولانا سید فرید وحیدی صاحب نے ان سے پوچھا حضرت! کیا حکیم الامت میں شان مجددیت تھی؟ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے انتہائی سنجیدگی سے فرمایا:

> بے شک وہ مجدد تھے، انہوں نے ایسے وقت میں دین کی خدمت کی جب کہ دین کو بہت احتیاج تھی (۷)

اکابر کا آپس میں احترام ومؤدت

مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم، حضرت مدنی رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں بیعت کی نیت سے حاضر ہوئے، حضرت مدنی رحمہ اللہ خود بیعت کرنے کے بجائے ان کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی خدمت میں لے گئے اور انہیں بیعت کرنے کے لیے سفارش فرمائی، مولانا دریا آبادی نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو پوری صورت حال بتائی کہ بیعت کے لیے جو بزرگ ہماری نظر میں ہیں، ان میں نمبر اول پر مولانا حسین احمد صاحب ہیں، اب آگے جناب کا جیسا ارشاد ہو، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا: آپ کا انتخاب بالکل صحیح

ہے، میں اس سے بالکل اتفاق کرتا ہوں، آپ مولانا حسین احمد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کیجیے، حضرت مدنی رحمہ اللہ نے فرمایا: لیکن مجھ میں اس کی بالکل اہلیت نہیں اور جناب کے ہوتے ہوئے کسی اور کی طرف رخ کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا مگر مجھ پر تو آپ کو اعتماد ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ میں اہلیت ہے، اب آپ اندازہ کریں کہ ان بزرگوں میں شدید سیاسی اختلاف کے باوجود آپس کے احترام وعقیدت، ایک دوسرے کے مرتبے کی پہچان اور حدود کی رعایت کا کیا عالم تھا، مولانا دریا آبادی صاحب نے دونوں بزرگوں کی ملاقات کا منظر یوں لکھا ہے:

> لوگ کہتے تھے کہ ان میں بے لطفی ہے، ناچاقی ہے، لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دو دشمن نہیں، بلکہ دو دوست گلے مل رہے ہیں، تعظیم وتکریم مولانا حسین احمد صاحب کی طرف سے تو خیر ہوتی ہی، عادت طبعی کی بنا پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بنا پر بھی، لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا تھا کہ ادھر سے بھی آداب رسم وتکریم میں کوئی کمی نہ تھی، لاحول ولا قوۃ، لوگ بھی کیسی کیسی بے پر کی اڑایا کرتے ہیں اور لوگ بھی کون؟ عوام کالانعام نہیں، اچھے خاصے پڑھے لکھے، ثقہ راوی، خود ان دونوں حضرات کے خدام ومریدین، بعض راوی زبانِ قال سے اور بعض زبانِ حال سے، الحمدللہ کہ دونوں روایتیں غلط نکلیں (۸)

دارالعلوم دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی رہائش گاہ کے پاس حضرت مدنی رحمہ اللہ کے حامی طلبہ نے چند پرچیاں پھینکیں، جن میں نامناسب اور ناشائستہ جملے لکھے گئے تھے، حضرت مدنی رحمہ اللہ کو جب اس کا علم ہوا تو تمام طلبہ کو مسجد میں جمع کر کے حضرت عثمانی کے مقام ومرتبہ سے انہیں آگاہ کرتے ہوئے خطاب فرمایا اور آخر میں فرمایا: جن طلبہ نے یہ پرچیاں پھینکیں، میں اور تو کچھ نہیں کرسکتا، البتہ رات کے آخری حصے میں اٹھ کر ان کے لیے بددعا کروں گا، اللہ اکبر! اندازہ کیجیے سیاست میں شدید اختلاف کے باوجود حضرت عثمانیؒ کی شان میں گستاخی کرنے سے حضرت مدنی کو کس قدر تکلیف پہنچی، اس سے ان بزرگوں کے مقام ومرتبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے؟ ہمارے استاذ ومربی حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے اکابر خلفاء میں سے تھے، ہم نے درجہ رابعہ تک ابتدائی کتابیں ان ہی کے پاس پڑھیں اور پھر ان کے مشورے سے دارالعلوم دیوبند گئے اور وہاں دورہ حدیث میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے شرف تلمذ سے بہرہ ور اور سرفراز ہوئے، حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب دورہ حدیث پڑھنے کے لیے دارالعلوم دیوبند جانے کا مشورہ دیا کرتے تھے، کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا: شیخ مدنی کے ہوتے ہوئے کہیں اور حدیث پڑھنے کا مشورہ میں کیسے دے سکتا ہوں؟

علمائے دیوبند ہر قسم کے بے راہ روی سے کوسوں دور

ان واقعات کو ذکر کرنے کا مقصد اختلاف رائے کے موقع پر علمائے دیوبند کے معتدل مسلک ومزاج کو واضح کرنا ہے، ایسے مواقع پر عموماً ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے، سب وشتم کرنے، بے جا الزامات لگانے اور پروپیگنڈہ کرنے کا ایک طوفان کھڑا کر دیا جاتا

ہےاور دونوں فریق ایک دوسرے کے اکابر کی شان میں گستاخی سے بھی دریغ نہیں کرتے ،علمائے دیوبند کا مسلک ومزاج اوران کا ذوق ومشرب اس قسم کی بے راہ روی سے کوسوں دور ہے، تقسیم ہند کے متعلق اکابر علمائے دیوبند کے اختلاف اوران کے مسلک کو ان چند واقعات کے آئینے میں آپ دیکھ سکتے ہیں، یہ ان کے اعتدال کی صرف ایک مثال ہے، رائے کے اختلاف کے دوسرے مواقع میں بھی ان کے اعتدال کا یہی عالم رہا،اب اگر کوئی شخص تقسیم ہند کے وقت دونظریوں میں سے کسی ایک کا حامی ہے،لیکن دوسرے نظریے کے اکابر کی عقیدت واحترام اس کے دل میں نہیں، ایسے شخص کو آپ خالص کانگریسی یا خالص مسلم لیگی تو کہہ سکتے ہیں،لیکن حضرت مدنیؒ اور حضرت تھانویؒ کی طرف انہیں اپنی نسبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔

رائے کے اختلاف میں تجاوز سے اجتناب

رائے کے اختلاف کے مواقع پر جو بھی شخص حدود سے تجاوز کرے، ذاتیات پر اتر آئے اور اکابر کی شان میں دریدہ دہنی یا بدگمانی کا شکار ہو، یقیناً ایسا شخص اکابر دیوبند کے معتدل مسلک ومزاج سے ہٹا ہوا ہے اور اگر وہ ان کی طرف اپنا انتساب کرتا ہے تو اس معتدل مسلک ومزاج کے مطابق اپنی تربیت کا انتظام واہتمام کرے، آج جب کہ علمائے دیوبند کی طرف نسبت کرنے والوں میں طریقہ کار کے اختلاف سے کئی سیاسی، جہادی اور سماجی جماعتیں بن گئی ہیں، اس لیے اعتدال کی تربیت کی اشد ضرورت ہے، مختلف جماعتوں کے ساتھ یہ وابستگی عموماً جذباتی ہوتی ہے اور جذبات کے بہاؤ کو حدود کے اندر رکھنے کے لیے اعتدال کے بہت مضبوط بند کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک گذارش

اس لیے میری مختلف جماعتوں اور تنظیموں سے دردمندانہ گزارش ہے کہ وہ اپنے کارکنوں اور اپنی جماعت سے وابستہ نوجوانوں کو اعتدال کی تربیت دیں، اسی طرح اہل مدارس، طلبہ کی تربیت کرتے ہوئے، ان میں اعتدال پیدا کرنے کی طرف خاص توجہ دیں کہ اعتدال سے ہٹ کر یا افراط ہے یا تفریط اور وہ دونوں گمراہی کے راستے ہیں، اعتدال ہی اس امت کی خصوصیت بھی ہے اور راہ نجات بھی وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (اور ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنادیا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے)

مصادر ومراجع

(۱) شیخ الاسلام کے حیرت انگیز واقعات، ص:۳ (۲) مقدمہ مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ، ص:۲،۳ (۳) حاشیہ مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم، ص:۱۷۲ (۴) حاشیہ مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم، ص:۱۷۲ (۵) مکتوبات شیخ الاسلام، جلد اول، ص:۱۴۳ (۶) مکتوبات شیخ الاسلام، جلد اول، ص:۴۳ (۷) تکملہ الاعتدال فی مراتب الرجال، ص:۲۱ (۸) حکیم الامت از دریا آبادی، ص:۳

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
محقق و مفکر، نئی دہلی۔ ہند

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تنقیدی اسلوب

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تصنیفی سرمایہ کا جائزہ لیں تو اس کا قابلِ لحاظ حصہ سیر وسوانح کے موضوع پر نظر آتا ہے، ان کا سلسلۂ 'تاریخِ دعوت وعزیمت' اپنی مثال نہیں رکھتا، اس میں امت کے مجدّدین ومصلحین کے احوال، دینی وعلمی خدمات، تجدیدی کارناموں اور داستانِ عزیمت کو بڑے مؤثر اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، ''سیرت سید احمد شہید'' ہندوستان کی تاریخ کے ایک عہد پر روشنی ڈالتی ہے اور سید شہیدؒ کے داعیانہ ومجاہدانہ کارناموں کا بھرپور انداز میں تعارف کراتی ہے، ان کے علاوہ سیر وسوانح کے موضوع پر مولانا کی اور بھی متعدد تصانیف ہیں، مثلاً صحبتے با اہلِ دل، حیاتِ عبدالحیؒ، مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت وغیرہ، ان کتابوں میں مولانا نے متعلقہ شخصیات کا جامع تعارف کرایا ہے، ان کے خاندانی اور ذاتی احوال وکوائف بیان کیے ہیں، ان کی علمی ودینی، دعوتی وتبلیغی، اصلاحی وتجدیدی اور دیگر خدمات پر روشنی ڈالی ہے، معاشرہ پر ان کے کتنے اثرات مرتب ہوئے؟ اور امت کو ان سے کتنا فائدہ پہنچا؟ اس کا تجزیہ کیا ہے، ان تصانیف میں مولانا ایک کامیاب اور ماہر سوانح نگار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، وہ کسی بھی موضوع کے تمام پہلوؤں کا اس طرح تجزیہ کرتے ہیں کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا۔

مولانا نے سوانح نگاری کے دوران عموماً متعلقہ شخصیات کی حیات اور خدمات کے ایجابی اور مثبت پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے اور ان کی خامیوں، کوتاہیوں اور منفی پہلوؤں کو نظر انداز کیا ہے، بعض حضرات نے اسے مولانا کی سوانح نگاری کا ایک نقص قرار دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ سوانح نگار کو کسی شخصیت کا تجزیہ غیر جانب دار ہوکر کرنا چاہیے، جس طرح وہ اس کی خوبیاں، کارنامے اور محاسن بیان کرے، اسی طرح اس کی ذمہ داری ہے کہ اگر اسے اس میں کوئی خامی اور منفی پہلو پائے تو اسے بھی نمایاں کرے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی حیثیت اصلاً ایک داعیٔ اسلام اور مصلح کی ہے، ان کی تمام تحریروں میں، جن میں سوانحی تحریریں بھی شامل ہیں، ان کی یہ حیثیت نمایاں ہے، کسی شخصیت پر لکھتے ہوئے انھوں نے اس کی خامیاں تلاش کرنے اور کمزوریاں نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ اس کے مثبت پہلوؤں ہی کو اجاگر کیا ہے، اس چیز کو مولانا نے اپنی ''افتادِ طبع'' قرار دیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

> مصنف کا عام اندازِ نگارش اور تصنیف وتالیف کا نہج شروع سے تعمیری، مثبت اور غیر مجادلانہ رہا ہے اور اختلافی مسائل اور لفظی نزاعات سے اس نے ہمیشہ اجتناب کیا ہے اور جہاں اس کو یہ خدمت انجام دینی پڑی اسے وقتی اور ضمنی طور پر انجام دیا اور وہ جلد اپنے مزاج اور معمول کے مطابق اصولی اور مقصدی مباحث ومسائل کی طرف واپس ہوگیا(۱)

اس مضمون میں مولانا کی ان تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں انھوں نے بعض شخصیات اور ان کے افکار پر تنقید کی ہے، یہ تحریریں ہمیں ایک نئے تنقیدی اسلوب سے متعارف کراتی ہیں، ان کی خوبی یہ ہے کہ ان میں مؤرّخانہ استناد اور زبان کی شگفتگی کے ساتھ اظہار و بیان میں متانت، سنجیدگی اور شائستگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے شخصیت کوئی بھی ہو، مولانا نے اس کا پورا احترام ملحوظ رکھا ہے، لیکن یہ احترام اظہارِ حق میں مانع نہیں ہوا ہے، انہوں نے متعلقہ شخصیت کی فکر میں جو انحراف محسوس کیا اسے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے پیش کرنا اپنا فریضہ سمجھا ہے۔

مولانا کا تنقیدی اسلوب ان کی جن کتابوں میں بہت نمایاں ہے، ان میں ''مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کش مکش'' کو امتیازی مقام حاصل ہے، اس کتاب میں وہ مغربی تہذیب کے زبردست ناقد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، ترکی، مصر، ایران، تونس، الجزائر، لیبیا اور دیگر مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کے درمیان برپا ہونے والی کش مکش کا انہوں نے بھرپور تجزیہ کیا ہے اور جن مسلم شخصیات نے ان ممالک میں مغربی افکار و نظریات کو رواج دینے کی کوشش کی ہے اور اس معاملے میں اہم کردار انجام دیا ہے، ان پر زبردست تنقید کی ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں جن مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کے درمیان زبردست معرکہ برپا ہوا، ان میں سرفہرست ترکی ہے، اس معرکہ میں مغربیت کا سپہ سالار کمال اتاترک تھا، اس نے ترکی سے اسلامیت کے تمام آثار کو ختم کرنے اور اس کو مغربی رنگ دینے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوا، مولانا نے اتاترک کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے

> کمال اتاترک کی قیادت میں ترکی نے نامذہبیت (سیکولرازم)، اپنے ماضی سے انحراف، بلکہ بغاوتِ شدید و جذباتی مغربیت اور عسکری آمریت کا جو رخ اختیار کیا، اس کے وجوہ و اسباب سمجھنے کے لیے اس تحریک و رجحان کے فکری و سیاسی قائد اور ترکی جدید کے معمارِ اعظم کمال اتاترک کے ذہنی ارتقاء، فکری نشو و نما اور اس کی مزاجی کیفیت کے سمجھنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ جمہوریت و عوامیت کے ادّعاء کے باوجود وہ ممالک جو کسی فوجی آمر کے قبضہ تصرف میں آجاتے ہیں وہ بہت حد تک اس کی شخصیت و مزاج کا عکس بن کر رہ جاتے ہیں اور ان کی جدید تشکیل کو سمجھنے کے لیے ان آمرین (Dictators) اور ان کے عناصرِ ترکیبی کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے.... ترکی قوم کو جلد سے جلد مغربی اقوام کے رنگ میں رنگ دینے اور مکمل طور پر ان کا ایسا ہم رنگ بنا دینے کے لئے، جس کے بعد کوئی امتیاز نہ رہے، اس نے ترکی ٹوپی اور سر کے ہر لباس کو خلافِ قانون قرار دیا اور ہیٹ کا استعمال لازمی کر دیا اور اس کے بارے میں اتنی شدّت برتی کہ گویا اس سے بڑھ کر کوئی اصلاح اور ترکی قوم کی زندگی اور عزت کے لئے کوئی شرط نہ تھی، یہ ہیٹ کی وہ خوں ریز جنگ تھی جس نے جنگِ صلیبی کی شکل اختیار کر لی.... کمال اتاترک نے واقعۃً قوم پر فتح پائی، ملک کو سیکولر (نامذہبی) اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا، جس میں اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل نہیں رہی، دین و سیاست میں تفریق ہوگئی اور یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے، ہر شخص اپنے لیے کسی مذہب کا انتخاب کر سکتا ہے، بغیر اس کے

کہ سیاست میں بھی اس کو دخل ہو، خلافت کے ادارہ کو ختم کر دیا گیا، شرعی اداروں اور محکموں اور اسلامی قانونِ شریعت کو ملک سے بے دخل کر کے سوئزرلینڈ کا قانونِ دیوانی، اٹلی کا قانونِ فوج داری اور جرمنی کا قانون بین الاقوامی تجارت نافذ کیا گیا اور پرسنل لاء کو یورپ کے قانونِ دیوانی کے مطابق و ماتحت کر دیا، دینی تعلیم ممنوع قرار پائی، پردہ کو خلافِ قانون قرار دے دیا، مخلوط تعلیم کا نفاذ کیا گیا، عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف جاری ہوئے، عربی میں اذان ممنوع قرار پائی، قوم کا لباس تبدیل ہو گیا، ہیٹ کا استعمال لازمی قرار پایا، غرض کہ کمال اتاترک نے ترکی قوم اور حکومت کی دینی اساس کو توڑ پھوڑ کے ختم کر دیا اور قوم کا نقطۂ نظر ہی بدل دیا۔ (۲)

اس کتاب کا ایک مفصّل باب مصر پر ہے، وہاں کی جن شخصیات نے مغربی تہذیب و معاشرت اور مغربی فکر و فلسفہ سے مرعوبیت کی بنا پر مغربیت کو فروغ دیا ہے، مولانا نے ان کی خوب خبر لی ہے اور ان کی فکر کا تجزیہ کر کے اس کے تار و پود بکھیر دیے ہیں، مثلاً شیخ محمد عبدہ جدید مصر کی ایک مشہور شخصیت ہیں، جن کے معاشرہ پر گہرے اثرات مرتّب ہوئے ہیں، ان کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے:

''جہاں تک شیخ محمد عبدہ کا تعلق ہے تو اس اعتراف کے ساتھ کہ انھوں نے اسلام کی مدافعت، نظامِ تعلیم کی اصلاح اور جدید نسل کو دین سے مانوس کرنے کے سلسلے میں بڑی مفید خدمت انجام دی، اس واقعہ کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم عربی میں تجدّد کے ابتدائی علم برداروں میں تھے، انھوں نے اسلام اور بیسویں صدی کی زندگی اور معاشرہ میں مطابقت پیدا کرنے کی پرزور دعوت دی، ان کے خیالات اور تحریروں میں مغربی اقدار سے گہرا تاثر پایا جاتا ہے اور وہ اسلام کی ایسی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ ان اقدار کے ساتھ میل کھانے لگے، اسی طرح وہ فقہ اور احکامِ شریعت کی ایسی تشریح و تاویل کی کوشش میں نظر آتے ہیں جس سے تمدنِ جدید کے مطالبات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل ہو سکے، اس لحاظ سے ان میں اور سرسید احمد خاں میں بہت کم فرق نظر آتا ہے، مفتی محمد عبدہ کا یہ میلان ان کی تفسیر، فتاویٰ اور ان کی تحریروں میں صاف طریقہ پر دیکھا جا سکتا ہے، ان کے بعد تجدد کے جو داعی پیدا ہوئے انھوں نے عام طور پر انہی کی کتابوں سے استفادہ کیا اور انہی کا حوالہ دیا ہے'' (۳)

شیخ محمد عبدہ کے شاگرد قاسم امین کو اس اعتبار سے شہرت حاصل ہے کہ انھوں نے مصر میں آزادئ نسواں کی تحریک چلائی اور اس موضوع پر مؤثر کتابیں تحریر کیں، اس کے نتیجے میں بے پردگی، مرد و زن کے اختلاط اور عورتوں کی آزادی کو بہت فروغ ملا، مولانا نے قاسم امین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

مغربی تہذیب و معاشرت سے گہرے تاثر کی ایک واضح مثال آزادئ نسواں کے مشہور مصری نقیب قاسم امین کی کتاب تحریر المرأۃ (عورت کی آزادی) نیز ان کی دوسری کتاب المرأۃ الجدیدۃ (خاتونِ جدید) ہے، پہلی کتاب میں مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ بے پردگی کی دعوت میں دین سے کوئی مخالفت نہیں پائی جاتی .... اس کتاب میں مصنف نے چار مسائل سے بحث کی ہے: (۱) پردہ (۲) عورت کا عام زندگی میں حصہ لینا (۳) تعدّدِ ازدواج (۴) طلاق، ان چاروں مباحث میں انھوں نے اہلِ مغرب کے مسلک کو اختیار کیا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہی اسلام کا مسلک

ہے، مغربی تعلیم، مغربی تہذیب اور اس کے اقدار سے مصنف کا گہرا تاثر ان کی دوسری کتاب ''خاتونِ جدید'' میں زیادہ نمایاں ہے.... اس میں مصنف نے مغربی تہذیب ومعاشرت کے طریقوں کو اختیار کرنے کی کھلی دعوت دی ہے.... یہ دونوں کتابیں مصر کے جدید حلقہ میں بڑی مقبول ہوئیں، ان کی اشاعت اور آزادئ نسواں کی تحریک میں تجدّد پسندوں نے جوسرگرمی دکھائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں میں آزادی و بے پردگی کی ایک شدید لہر پیدا ہوگئی، مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات کا رواج ہو چلا اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے مصری لڑکیاں اور طالبات یورپ اور امریکہ کا سفر کرنے لگیں (۴)

جدید مصر کے ادباء اور دانشوروں میں ڈاکٹر طہ حسین کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے مصر کی نئی نسل کو مغرب زدہ بنانے میں اہم کردار انجام دیا ہے، مولانا نے اپنے تبصرہ میں دونوں پہلوؤں میں توازن برقرار رکھا ہے، وہ جہاں طہ حسین کی ادبی خدمات کا برملا اعتراف کرتے ہیں، وہیں ان کی مغرب زدگی پر بھرپور نقد سے بھی گریز نہیں کرتے، لکھتے ہیں

ڈاکٹر طہ حسین جدید عربی ادب کے سرخیل اور نوجوانوں اور نئے لکھنے والوں کے محبوب اور ان کے مثالی ادیب ومفکر ہیں، مشرق وسطیٰ کی جدید نسل پر شاید ان سے زیادہ کسی نے اثر نہیں ڈالا.... انہوں نے مکتب میں داخل ہو کر قرآن شریف حفظ کیا، کچھ عرصہ ازہر میں رہے، لیکن ان دونوں سے بیزاری کا اظہار ان کی کتابوں میں جا بجا نظر آتا ہے، انہوں نے بہت سے ایسے خیالات وتحقیقات کا اظہار کیا، جو ادب وتاریخ اور دین کے مسلّم ومعروف خیالات و عقائد کے خلاف تھیں اور جن پر مصر کے ادبی ودینی حلقوں میں سخت تلاطم اور ہنگامہ پیدا ہوا.... طہ حسین مغربی تمدن و فلسفہ کے گرویدہ اور فرانسیسی ثقافت وادب کے دلدادہ ہیں، ان کو فرانس سے گہرا ذہنی وادبی لگاؤ تھا.... ان کی کتابوں میں مستشرقین کے خیالات وتحقیقات کا کامل عکس پایا جاتا ہے، ان کو ان کے بنیادی خیالات کو پھیلا کر بیان کرنے کا خاص ملکہ ہے، ذہنی اپج، طبیعت کی بے چینی اور جدّت پسندی ان کی خصوصیات ہیں (۵)

مصر کے علمی ودینی حلقوں میں وہاں کے ازہری عالم اور جسٹس علی عبدالرازق کے ان خیالات سے بڑی بے چینی اور اضطراب پیدا ہوگیا کہ اسلام نے نظامِ حکومت کے لیے کچھ اصول ونظریات نہیں دیے ہیں اور خلفائے راشدین نے سیکولر بنیادوں پر حکومت چلائی تھی، ان کے ان خیالات پر مصر میں زبردست بحث ومباحثہ ہوا اور ان کے رد میں متعدد کتابیں شائع ہوئیں، مولانا نے مصر میں اسلامیت ومغربیت کی کش مکش کے ضمن میں علی عبدالرازق کا بھی تذکرہ کیا ہے فرماتے ہیں:

ازہری عالم شیخ علی عبدالرازق، جو اس وقت مصر میں شرعی قاضی (جج) بھی تھے، ان کے قلم سے ایک کتاب شائع ہوئی، جس کا نام الاسلام و أصول الحکم ہے، اس نے مصر کے دینی حلقہ میں سخت بے چینی اور ناراضگی کی لہر پیدا کر دی اور اس کے نتیجے میں مصنف کو ازہر کی سند اور اس کے حقوق وامتیازات سے محروم ہونا پڑا، اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقین کے خیالات تعلیم یافتہ طبقہ میں یہاں تک مقبول ہو چکے تھے کہ ایک عالمِ دین ان کی پرزور وکالت اور تبلیغ پر آمادہ ہو جاتا ہے، اس کتاب میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ خلافت ایک محض عربی اور رائج الوقت نظام تھا جس کو مسلمانوں نے اختیار کر لیا تھا

اور شریعت اس کا پابند نہیں کرتی، وہ ثابت کرتے ہیں کہ خلافت، قضاء، سرکاری عہدے اور حکومت کے مناصب سب خالص دنیاوی عہدے اور انتظامات ہیں، جن کی نہ کوئی دینی حیثیت ہے نہ شریعت سے ان کا کچھ تعلق ہے'' (۶)

اسی طرح مولانا نے دیگر مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کے درمیان برپا کش مکش کی تاریخ بیان کی ہے، ان ممالک میں مغربی تہذیب کو رواج دینے میں کن شخصیات کا حصہ ہے؟ ان کا تذکرہ کیا ہے، ان کے افکار ونظریات کو نقل کر کے ان پر نقد کیا ہے اور صحیح اسلامی فکر پیش کیا ہے، یہاں مولانا کی تمام تنقیدوں کو نقل کرنا ممکن نہیں ہے، مزید ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جس میں مولانا نے تونس کے پہلے صدر ''حبیب بورقیبہ'' کے خلافِ شریعت اقدامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کے گمراہ کن خیالات نقل کرتے ہوئے ان پر تنقید کی ہے، فرماتے ہیں

ہم ان بیانات پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے، اس لیے کہ صدر بورقیبہ کوئی قابلِ ذکر علمی مقام نہیں رکھتے اور ان بیانات کے پیچھے کوئی فکر ومطالعہ نہیں ہے، البتہ ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ صدر بورقیبہ احساسِ کہتری اور ذہنی غلامی کا شکار ہیں، انہوں نے کسی اسلامی علم کی تحصیل اس عمر میں نہیں کی جس میں مہارت پیدا کی جاسکتی تھی، اب ضروری سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جو شخص اس قسم کے اسلام دشمن خیالات رکھتا ہے، وہ دائرۂ اسلام میں بھی باقی رہ سکتا ہے یا نہیں؟ اور کیا اسے ایک اسلامی اکثریت کے ملک پر حکم رانی کا حق حاصل ہے؟ (۷)

یہ کتاب اگرچہ مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کش مکش کی دستاویز ہے، لیکن اس میں مولانا نے ہندوستان کا بھی جائزہ لیا ہے اور یہاں مغربی کلچر کے فروغ کی تاریخ بیان کی ہے، اس ضمن میں انھوں نے سرسید احمد خاں کی شخصیت اور افکار پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا تجزیہ کیا ہے، یہاں اس موضوع پر مولانا کے چند اقتباسات نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے

سرسید احمد خاں نے آخری مغل سلطنت کا زوال (جو مسلمانوں کی عظیم حکومت کی ایک دھندلی اور پھیکی سی تصویر تھی) اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انہوں نے اس ہزیمت، اہلِ ہند کی دل شکستگی، ان کی عظیم جماعت کے مقابلہ میں مٹھی بھر غیر ملکیوں کی فتح کا مشاہدہ کیا، مسلمانوں کو اس کوشش کی جو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی اس کو بھی دیکھا، وہ قوم جو کل اس ملک کی حاکم تھی، اس کی ذلت وپستی، بڑے بڑے خاندانوں اور گھرانوں کی فلاکت اور انگریزوں کی شان وشوکت (جو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے ملبہ پر قائم ہو رہی تھی) نیز ان کی حکومت اور ساحرانہ تہذیب کے مناظر بھی دیکھے، اس کے علاوہ ملازمت، رفاقت اور دوستی وتعارف کے ذریعہ ان کو انگریزوں سے طویل واسطہ پڑا تھا اور بہت قریب سے ان کی زندگی کے مطالعہ کا موقع ملا تھا، وہ ان کی ذہانت، قوتِ عمل اور ان کے تمدّن سے متاثر ہوئے، وہ ایک ذہین، نہایت ذکی الحس، سریع الانفعال اور دردمند قسم کے آدمی تھے، انھوں نے متوسط درجہ کی دینی تعلیم پائی تھی اور دینی علوم اور کتاب وسنت پر ان کی نظر گہری اور وسیع نہ تھی، جلد رائے قائم کر لینے اور جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کرنے کے عادی تھے، وہ انگریزوں سے اس طرح متاثر ہوئے جس طرح کوئی مغلوب غالب سے یا

کوئی کمزور طاقت ور سے متاثر ہوتا ہے، انھوں نے شخصی طور پر انگریزی تہذیب اور طرزِ معاشرت کو اختیار کیا اور دوسروں کو بھی بڑی گرم جوشی اور قوت کے ساتھ اس کی دعوت دی، ان کا خیال تھا کہ اس ہم رنگی، حاکم قوم کی معاشرت و تمدّن اختیار کرنے اور ان کے ساتھ بے تکلف رہنے سے وہ مرعوبیت، احساسِ کہتری اور احساسِ غلامی دور ہو جائے گا جس میں مسلمان مبتلا ہیں اور حکام کی نظر میں ان کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی اور وہ ایک معزز مساوی درجہ کی قوم کے افراد معلوم ہونے لگیں گے، یہ خیال اور نقطہ نظر ان کے بعض مضامین میں بہت صفائی کے ساتھ ملتا ہے(۸)

مغربی تہذیب و معاشرت سے سرسید کی تاثر پذیری کے حوالے سے مولانا لکھتے ہیں:

''وہ اس تہذیب و معاشرہ سے اس طرح متاثر ہوئے کہ ان کے دل و دماغ، اعصاب اور ساری فکری صلاحیتیں اس سے وابستہ ہو گئیں، ۱۲/اکتوبر ۱۸۷۰ء میں وہ اس تہذیب کے گرویدہ اور ہندوستان کی مسلم سوسائٹی میں ان اقدار اور اصولوں کی بنیاد پر اصلاح و تغیّر کے پرجوش داعی اور مبلّغ بن کر اپنے ملک واپس ہوئے اور پورے خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ انہوں نے اس تحریک و دعوت کا علم بلند کیا اور اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اس کے لیے وقف کر دیں، ان کا نقطہ نظر خالص مادی ہو گیا، وہ مادی طاقتوں اور کائناتی قوتوں کے سامنے بالکل سرنگوں نظر آنے لگے، وہ اپنے عقیدہ اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے، انہوں نے اس میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ عربی زبان و لغت کے مسلّمہ اصول و قواعد اور اجماع و تواتر کے خلاف کہنے میں بھی ان کو باک نہ رہا، چنانچہ ان کی تفسیر نے دینی و علمی حلقوں میں سخت برہمی پیدا کر دی(۹)

مولانا کے تنقیدی اسلوب کی ایک نمائندہ کتاب ''قادیانیت۔ مطالعہ و جائزہ'' ہے، اس میں انھوں نے فتنۂ قادیانیت کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور اسے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش قرار دیا ہے، ردقادیانیت پر وسیع لٹریچر موجود ہے، اس میں بہت سی ایسی کتابیں ہیں جو مجادلانہ اور مناظرانہ اسلوب میں لکھی گئی ہیں اور ان میں قادیانیت کے بانی مرزا غلام احمد کے بارے میں سخت زبان استعمال کی گئی ہے، لیکن مولانا کا اسلوب اس حسّاس اور نازک موضوع میں بہت محتاط رہا ہے، انہوں نے مرزا غلام احمد اور ان کی تحریک کے بارے میں بہت شائستہ زبان استعمال کی ہے اور اس طرزِ تخاطب سے مکمل احتراز کیا ہے جو اس زمانے میں رائج تھا، مولانا نے اپنے اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے

مناظرانہ و متکلمانہ مباحث کی ہندوستان کے دورِ آخر میں ایک خاص زبان اور خاص اسلوبِ تحریر بن گیا ہے، جس کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے، مصنف نے اس کی پابندی ضروری نہیں سمجھی، اس کتاب میں مناظرانہ جوش کے بجائے مؤرخانہ متانت زیادہ ملے گی اور جو لوگ مناظرانہ و فریقانہ کتب کے ایک خاص طرز و لہجہ کے عادی ہیں، شاید ان کو اس کتاب کو پڑھ کر مایوسی اور شکایت ہو، لیکن مصنف اس کے لیے معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا، اس نے یہ کتاب جس طبقہ اور جس مقصد کے لیے لکھی ہے اور جو معیار اس کے لیے مقرر کیا ہے، اس کے لیے یہی طرز مناسب تھا(۱۰)

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مولانا نے اس کتاب میں مرزا غلام احمد کا جہاں بھی نام لیا ہے وہاں ان کے نام کے ساتھ ''صاحب'' ضرور لگایا ہے، کتاب میں مولانا نے مرزا قادیانی اوران کے خلیفۂ اوّل حکیم نورالدین کے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں، ان کے خیالات وافکار کا تجزیہ کیا ہے اوران کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، ہر جگہ پوری متانت اور شائستگی کو ملحوظ رکھا ہے، مولانا کو شکایت ہے کہ مرزا قادیانی نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ پیغمبروں اور مصلحین ومجددین تو کجا، باوقار اور سنجیدہ مصنفین کے اسلوب سے بھی ادنیٰ مناسبت نہیں رکھتا، ان کی بعض تصانیف کے حوالے سے مولانا نے لکھا ہے

> ان تصانیف میں مرزا صاحب کی طبیعت کا جوش بہت بڑھ گیا ہے اوران کی تحریر میں طنز وتعریض کا ایک ایسا عنصر اور ایسی تلخی آ گئی ہے جس کی وجہ سے یہ کتابیں سنجیدہ بحث ونظر کی کتابوں اور اصلاحی ودعوتی تصانیف کے بجائے ہجو وطنز کی کتابوں میں شامل ہو جاتی ہیں، ان کتابوں میں مرزا صاحب نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ پیغمبروں سے قطع نظر اور مصلحین ومجدّدین کو بھی چھوڑ کر متین وسنجیدہ مصنفین اور باوقار اہلِ قلم سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا، انہوں نے حیات ونزولِ مسیح کے عقیدہ کا اور اس کے ماننے والوں کا جس انداز میں مذاق اڑایا ہے وہ ایک علمی بزم سے زیادہ امراء کے درباروں اور مصاحبوں کی فقرہ بازیوں سے مشابہ ہے، نیز ان کے اندر جو مجادلانہ روح اور وکیلانہ موشگافیاں ہیں، ان کو کلامِ نبوت اور مزاجِ نبوت سے کوئی مناسبت نہیں (۱۱)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مولانا نے قادیانیت پر تنقید کرنے میں کوئی نرمی دکھائی ہو یا مداہنت سے کام لیا ہو، وہ صاف الفاظ میں قادیانیت کو اسلام کے متوازی ایک مذہب اور نبوت محمدی کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں

> قادیانیت کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے صدہا دینی وعلمی اختلافات اور مکاتبِ فکر میں سے ایک دینی وعلمی اختلافِ رائے اور ایک خاص مکتبِ فکر ہے اور اس کے پیرو امتِ اسلامیہ کے مذہبی فرقوں اور جماعتوں میں سے ایک مذہبی فرقہ اور جماعت ہیں اور یہ اسلام کی کلامی اور فقہی تاریخ کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں، لیکن قادیانیت کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنے سے یہ غلط فہمی اور خوش گمانی دور ہو جاتی ہے اور ایک منصف مزاج اس نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیت ایک مستقل مذہب اور قادیانی ایک مستقل امت ہیں، جو دین اسلام اور امت اسلامیہ کے بالکل متوازی چلتے ہیں (۱۲)

آگے لکھتے ہیں:

> اسلام کے خلاف وقتاً فوقتاً جو تحریکیں اٹھیں ان میں قادیانیت کو خاص امتیاز حاصل ہے، وہ تحریکیں یا تو اسلام کے نظامِ حکومت کے خلاف تھیں یا شریعت اسلامی کے خلاف، لیکن قادیانیت درحقیقت نبوت محمدی کے خلاف ایک سازش ہے۔ وہ اسلام کی ابدیت اور امت کی وحدت کو چیلنج ہے، اس نے ختمِ نبوت سے انکار کر کے اس سرحدی خط کو بھی عبور کر لیا جو اس امت کو دوسری امتوں سے ممتاز ومنفصل کرتا ہے اور جو کسی مملکت کے حدود کو حاضر کرنے کے لیے قائم کیا جاتا ہے (۱۳)

مولانا کی ایک تصنیف ''دین اسلام اور اوّلین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں'' کے نام سے ہے، اس میں اہل سنت اور شیعی

فرقہ اثناعشریہ کے بعض عقائد کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے، عموماً اس طرح کے مطالعے مناظرانہ انداز میں کیے جاتے ہیں اور کیے گئے ہیں، اہل سنت کی طرف سے ردِّ شیعیت پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بیش تر پر مناظرانہ ومجادلانہ رنگ غالب ہے، لیکن اس کتاب کا رنگ ہی دوسرا ہے، اس میں صدرِ اسلام کی دو تصویریں الگ الگ پیش کی گئی ہیں، ایک تصویر وہ ہے جو اہل سنت کی کتابوں سے سامنے آتی ہے، یہ بڑی تاب ناک اور روشن تصویر ہے، دوسری تصویر تاریک تر اور بھیانک ہے، یہ شیعی نقطۂ نظر کی حامل کتابوں سے سامنے آتی ہے، مولانا نے پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ دونوں تصویریں پہلو بہ پہلو قارئین کے سامنے رکھ دی ہیں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے، مولانا کی پوری بحث کا خلاصہ کتاب کے پیش لفظ میں آ گیا ہے، لکھتے ہیں

> زیرِ نظر کتاب کسی مخصوص دینی مسلک، نظامِ عقائد یا مکتبِ فکر کے اثبات واحقاق اور اس کے مخالف مسلک، عقیدہ یا فرقہ وجماعت کی تنقید وتردید کی کوئی متکلمانہ ومناظرانہ کتاب نہیں ہے، جو لوگ اس نظر سے اس کتاب کو پڑھیں گے، اندیشہ ہے کہ ان کو مایوسی ہوگی.... اس کتاب میں اولین مسلمانوں اور تاریخ اسلام کے مثالی ومعیاری عہد (عہدِ رسالت وعہدِ صحابہ) میں اسلامی تعلیمات کے اثرات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی وتربیتی مساعی کے نتائج کا ایک ہلکا سا نقشہ پیش کیا گیا ہے.... پھر اہلِ سنت کے اس اجماعی عقیدہ اور تسلسل وتواتر کے ساتھ فہمِ دین، حیاتِ نبوی، عہدِ صحابہ اور تاریخ اسلام کی اس تعبیر وتصویر کے بالکل متوازی فرقۂ امامیہ اثناعشریہ (اپنے اولین بانی سے لے کر امام خمینی تک) جو نقطۂ نظر رکھتا ہے اور اس نے اس کو اپنے عقیدہ وعمل کی اساس اور اپنے فرقہ وجماعت کا شعار بنایا ہے، اس کو خود اسی کے مستند نمائندوں، دینی پیشواؤں اور ان کی معتبر ومسلّم تصنیفات اور کتابوں کے الفاظ میں پیش کر دیا گیا ہے اور اس کا فیصلہ فطرتِ سلیم، ذوقِ صحیح اور عقل عام پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان میں سے کون سی تعبیر وتصویر پیغمبر اور دین کے شایانِ شان ہے (۱۴)

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تنقیدی اسلوب کے چند نمونے ہیں، یہ بات صحیح ہے کہ مولانا نے اپنی سوانحی تحریروں میں عموماً ایجابی رویّہ اختیار کیا ہے اور مثبت پہلوؤں کو پیش کیا ہے، لیکن اہم دینی تقاضوں کے پیش نظر جب کبھی انھیں بعض شخصیات پر تنقید کرنی پڑی ہے تو انھوں نے متانت اور شائستگی کا پورا خیال رکھا ہے اور مجادلانہ ومناظرانہ انداز سے قطعی پرہیز کیا ہے۔ یہ مولانا کی شخصیت کا ایسا قابل تقلید پہلو ہے، جسے موجودہ دور میں اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

مصادر ومراجع

(۱) عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح، ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۳ (۲) مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کش مکش، ابوالحسن علی ندوی، ص ۷۳۔۸۱ (۳) حوالہ سابق، ص ۱۳۷۔۱۳۸ (۴) حوالہ سابق، ص ۱۴۴۔۱۴۶ (۵) حوالہ سابق، ص ۱۵۲۔۱۵۴ (۶) حوالہ سابق، ص ۱۴۸، حاشیہ (۷) حوالہ سابق، ص ۲۰۷ ۔ ۲۰۸ (۸) حوالہ سابق، ص ۹۵۔۹۶ (۹) حوالہ سابق، ص ۹۹ (۱۰) قادیانیت: مطالعہ وجائزہ، ابوالحسن علی ندوی ص ۸ (۱۱) حوالہ سابق، ص ۶۵۔۶۶ (۱۲) حوالہ سابق، ص ۱۳۷ (۱۳) حوالہ سابق، ص ۱۵۰۔۱۵۱ (۱۴) دین اسلام اور اوّلین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں، ابوالحسن علی ندوی، ص ۷۔۸

مولانا سجاد الحجابی
دار العلوم نرشک، مردان

علوم اسلامی میں نحو کا مقام و مرتبہ

علوم عربیہ میں علم نحو کی حیثیت

علم النحو ان قوانین کے جاننے کا علم ہے جن کے ذریعے کلمات عربیہ کے معرب و مبنی ہونے کے اعتبار سے ترکیبی احوال کی معرفت حاصل ہو جائے، علامہ ابن خلدونؒ نے اپنے شہرہ آفاق مقدمہ میں ذکر کیا ہے کہ عربی زبان کے علوم میں سے چار علوم بنیادی حیثیت رکھتے ہیں (۱) لغت (۲) نحو (۳) بیان (۴) ادب، پھر فرماتے ہیں کہ ان سب میں سے زیادہ مہتم بالشان اور اولیت کا حامل علم النحو ہے کیونکہ جب اس کے ذریعے مقاصد پر دلالت کرنے والے اصول و قواعد واضح ہو جاتے ہیں، تو تب ہی فاعل، مفعول، مبتدا اور خبر کی الگ الگ صحیح پہچان ہو جاتی ہے، اگر علم النحو نہ ہو تو افادہ کی بنیاد ہی مجہول رہ جاتی۔

حق تو یہ تھا کہ ان چاروں علوم میں سے علم اللغة کو حصول کے حوالے سے مقدم کیا جاتا، لیکن لغت چونکہ اکثر احوال میں اپنے اپنے مقامات پر بعینہا باقی ہیں، ان میں کوئی رد و بدل واقع نہیں ہوتی، بخلاف اِعراب کے جو اسناد، مسند اور مسند الیہ پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ بالجملہ رد و بدل کا بہت زیادہ شکار ہو چکے ہیں، ان ہی وجوہات کی بناء پر علم النحو کو علم اللغة سے زیادہ اہمیت و اولیت حاصل ہوگئی، کیونکہ علم النحو سے ناواقف رہنے کی وجہ سے باہمی افہام و تفہیم میں بالکلیہ خلل واقع ہو جاتا ہے، جبکہ علم اللغة میں تقریبا ایسی کوئی بات پیش نہیں آتی۔

ابن خلدون آگے فرماتے ہیں کہ علماء نحو نے کلام عرب سے قواعد اور کلیات کی شکل میں ایسے قوانین مستنبط کئے کہ ان پر باقی اقسام کا قیاس کیا جا سکے تا کہ شبیہ کو دوسرے شبیہ سے ملایا جا سکے جیسے الفاعل مرفوع والمفعول منصوب والمبتدا مرفوع مزید لکھتے ہیں پھر انہوں نے جب دلالت کے رد و بدل کو انہی کلمات کے حرکات کے رد و بدل کی وجہ سے پایا تو اصطلاح کے طور پر اس کو اعراب کا نام دیا اور اس تغیر کے سبب کو عامل کا نام دیا اور یوں وہ اصطلاحات اس علم کے ساتھ خاص ہو گئے، اور اِسی مخصوص فن صناعت کو اپنی اصطلاح میں علم النحو کا نام دیا(۱)

علم النحو کی وضع کیے جانے میں بنیادی دینی پہلو

بعض روایات، نحو کے وضع کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک بہت ہی مضبوط دینی سبب کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں، وہ یہ کہ کلام عربی میں لوگوں کی ترکیبی و اِعرابی غلطیاں بڑھتے بڑھتے کلام الٰہی تک سرایت کر گئیں، جیسا کہ مروی ہے کہ ایک آدمی

نے سورتوبہ کی مندرجہ ذیل آیت پڑھی وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖٓ اِلَی النَّاسِ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ اَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَ رَسُوْلُہٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰہِ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِیْم (۲) کہ اصل میں قرأت ورسولہ میں لام کے پیش (ضمہ) کے ساتھ ہے، لیکن اس آدمی نے لام کے زیر (کسرہ) کے ساتھ پڑھا، جس کی وجہ سے معنی تبدیل ہوکر بگڑ گیا، اصل آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے بری ہیں جبکہ کسرہ کے ساتھ غلط پڑھنے کی وجہ سے ترجمہ الٹ ہوکر یہ بن گیا اللہ تعالی مشرکین اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بری الذمہ ہے (اعاذنا اللہ منہ) اور یوں جب ایک دیہاتی نے یہ آیت ورسولہ (بالضم) کے بجائے لام کے کسرے کے ساتھ ورسولِہٖ سنی، تو برجستہ کہا کہ اللہ تعالی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بری ہے؟ اگر اللہ تعالی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بری ہے تو میں بھی ان سے بیزار ہوں، اس دیہاتی کی یہ بات جب سیدنا عمرؓ تک پہنچی تو آپ نے اسے صحیح آیت بتلا کر حقیقت سے آگاہ فرمایا، سیدنا عمرؓ نے پھر یہ حکم نامہ بھی جاری فرمایا کہ لغتِ عربی کے واقف کار عالم کے سوا کوئی قرآن کریم نہ پڑھائے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا علیؓ نے ایک دیہاتی کو آیت قرانی لَا یَاْکُلُہٗٓ اِلَّا الْخَاطِؤُن کے بجائے لَا یَاْکُلُہٗ اِلَّا الْخَاطِیْنَ پڑھتے ہوئے سنا، یاد رہے کہ اس مقام پر صحیح لفظ اِلا الخاطؤن ہے جو کہ لَا یَاْکُلُہٗ کے لئے فاعل واقع ہو رہا ہے اور اِلَّا الْخَاطِیْن مفعول ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہے، کیونکہ یہ لفظاً ومعناً دونوں اعتبار سے سخت (فاش) غلطی ہے تو سیدنا علیؓ یہ سن کر گھبرا گئے، اسی ڈر سے انہوں نے علم النحو کے بنیادی قواعد وضوابط کا ایک ابتدائیہ وضع فرما کر اپنے شاگرد ابوالاسود الدوئلی (م:۶۹ھ) کو عنایت فرمایا اور حکم دیا کہ انح ھذا النحو (اسی طریقے پر آگے بڑھو)۔

لہٰذا جب بھی کوئی معاملہ پیش آیا وقت کے علما وائمہ فحول نے خوب دقت نظری ودور بینی سے کام لیتے ہوئے اسے بخوبی حل کیا، اسی کی ایک کڑی ائمہ اسلاف کی اولین فرصت میں علم النحو میں تصنیفی وتالیفی کام کی طرف پوری طرح متوجہ ہونا بھی ہے، جس کے نتیجے میں جلد ہی علم النحو کی ترویج ونشر واشاعت کا کام وجود پذیر ہوا جو کہ ان کی مخلصانہ جدوجہد تھی، اور ان کی تصانیف چھوٹے چھوٹے رسائل یا گنتی کے چند اوراق کی صورت میں سامنے آنے لگیں، جو بجا طور پر ''بقامت کہتر بقیمت بہتر'' کے مصداق تھے یہاں تک کہ عربیت کے سرخیل اعظم، امام عبقری خلیل بن احمد فراہیدیؒ کا عہد آیا اور انہوں نے اپنے تصانیف کے ذریعے علم النحو کے امام اول سیبویہ کے لئے راستہ ہموار کیا۔

ابن خلدون لکھتے ہیں: پھر ابوالاسود الدوئلی کے بعد بھی علماء علم النحو سے متعلق لکھتے رہے یہاں تک کہ ہارون الرشید کے دور میں خلیل بن احمد فراہیدی کی عہد زریں آ پہنچی۔

علم النحو واللغۃ کے علامہ، ڈاکٹر محمود الطناحی مصری لکھتے ہیں علم النحو کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ زوال کا شکار تھی کہ اس کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھنے کو تھا، خاص طور سے عربوں میں ان کے خداداد ملکہ رفتہ رفتہ ناپید ہونے کی وجہ سے لوگ علم النحو کی تدوین

کے اس قدر محتاج تھے جتنا پیاسا آدمی ٹھنڈے پانی کا اور جس قدر کہ عرب اس سے بے اعتنائی کا شکار تھے تو حسن اتفاق سے انہی ایام میں امام خلیل بن احمد فراہیدی نے اس علم کو چھانٹا، اس کے ادھورے ابواب کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، پھر جب ان سے امام سیبویہ نے اس علم کو حاصل کیا تو انہوں نے اس کی نامکمل تفریعات کو تکمیل کی معراج پر پہنچا کر اس کے ادلہ وشواہد کی بیخ بوکر کثرتِ دلائل سے نوازا، اور تشنگان علم النحو کی سیرابی کا سامان مہیا کر دیا، جس کی صورت یہ بنی کہ عظیم شہرہ آفاق کتاب (الکتاب لسیبویہ) تصنیف فرمائی جو کہ علم النحو میں بعد کی تمام کتب کے لئے امام کی حیثیت رکھتی ہے، یہی علم النحو کا بہترین ترویجی وارتقائی زمانہ تھا۔

الغرض تمام علوم عربیہ میں سے علم النحو وہ علم ہے جس میں سلف صالحین ہی کے زمانے سے باقاعدہ تصنیف وتالیف کا لازوال آغاز ہوا، جس کی وجہ سے یہ علم، علوم عربیت کے لئے سنگ بنیاد اور مین ستون قرار دیا گیا(۳)

علم النحو کی عظمت ومرتبت

امام ابو العباس احمد بن یحیی الثعلب کا قول ہے: لا یصح الشعر ولا الحدیث ولا القران الا بالنحو، النحو میزان ھذا کلہ یعنی علم النحو کے بغیر نہ تو شعر کو صحیح پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے، نہ قرآن کریم کو، اور نہ ہی حدیث وغیرہ کو، یہ علم ان تمام علوم وفنون کے لئے ترازو ہے، نیز فرمایا'' تعلموا النحو فانہ اعلی المراتب''علم النحو سیکھو اس لئے کہ اس کا مرتبہ نہایت بلند ہے(۴)

ابو بکر الشنتریني نے فرمایا، اگر علم النحو کے بے شمار فضائل ومناقب میں سے مندرجہ ذیل فضیلت کے علاوہ اور کوئی فضیلت نہ ہوتی تو تنہا یہی اس کی فضیلت ومنقبت کے لئے کافی تھا اور وہ یہ کہ اسی علم کی وجہ سے اس علم کا واقف کار عالم، جملہ علوم کو قبول کرنے کے لائق اور باقی تمام علوم پر ڈوری ڈال سکتا ہے اور ان میں مجتہدانہ مجددانہ صلاحیتوں سے معمور ہو کر تخلیقی کارنامے انجام دے سکتا ہے اور تمام علوم کی لگام اس کے ہاتھ میں آجاتا ہے، پھر کوئی علم اس کے لئے مشکل نہیں رہتا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ علم ان تمام علوم سے مستغنی ہے اور دوسرے تمام علوم اس کے محتاج ہیں، اسی وجہ سے علم النحو کا نام العلم المستطیل یعنی تمام علوم پر جال پھینکنے والا اور ان پر حاوی علم قرار دیا گیا ہے۔

ابوبکر احمد بن موسیٰ بن مجاہد سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں ابو العباس احمد بن یحیی الثعلب کی مجلس میں شریک تھا کہ ہماری گفت وشنید کا پہیہ مختلف علوم کے گرد گھوم رہا تھا، اسی دوران شیخ النحو امام ابو العباس احمد بن یحیی الثعلب نے مجھے فرمایا اے ابوبکر! تم لوگ قرآن کریم کے (الفاظ ومعانی) سیکھنے سکھانے میں مشغول ہوئے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے، اہل فقہ نے فقہ کو اوڑھنا بچھونا بنایا تو ان کا سفینہ بھی ساحل سے جا لگا، جب کہ میں تو زید وعمرو (یعنی علم النحو) میں منہمک رہا، اب نہ جانے کل قیامت کے دن اللہ تعالی کے ہاں میرا کیا فیصلہ ہوگا اور گڑگڑا کر رونے لگے، میں ان کے پاس سے اٹھ کر گھر چل آیا، اسی رات میں نے خواب میں امام محمد بن احمد بن غالب کو دیکھا، انہوں نے مجھے فرمایا اے ابوبکر! کیا آپ ابو العباس احمد بن یحییٰ الثعلب کو جانتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں ہمارے دوست ہیں، تو فرمانے لگے کہ جب صبح ہو تو اس پر میرا سلام پیش کرنا اور اس کو کہنا کہ کل قیامت کے دن تم

صاحب العلم المستطیل ہوں گے،یعنی تمام علوم پر جال ڈال کر سب پر دسترس حاصل کرنے والے ہوگے،ابوبکر بن مجاہد فرماتے ہیں کہ علم المستطیل کا مطلب یہ ہے کہ ایک نحوی علم النحو میں پختگی ومہارت کی وجہ سے تمام علوم پر حاوی ہوجاتا ہے، کیونکہ جملہ علوم، علم النحو کے محتاج ہیں۔

حدیث نبویؐ کے سیکھنے سے پہلے علم النحو کے حصول کی ضرورت واہمیت

حضرات متقدمین کے ہاں علم النحو کی اہمیت اس قدر تھی کہ وہ علم النحو کی مشغولیت اوراس کے سیکھنے کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حصول سے بھی مقدم بتلاتے تھے،حدیث سے پہلے علم النحو کو اہمیت واولیت کا حامل گردانتے ہوئے زمام التفات ابتداء ہی سے اسی کی طرف متوجہ کر لیتے تھے،خطیب بغدادی نے ذکر کیا ہے کہ عبدالعزیز ابن محمد دراوردیؒ،مغیرہ بن عبدالرحمٰن کے والد کی خدمت میں آکر احادیث مبارکہ سنایا کرتے ،ایک دفعہ وہ پڑھنے لگے تو بہت فاش اعرابی غلطیاں کرنے لگے تو میرے والد یعنی عبدالرحمٰن نے ان سے کہا: ویحك یا دراوردی،أ نت کنت باقامة لسانك قبل هذا الشان احریٰ ؟یعنی:اے دراوردی! تیرا استیاناس ہوتم تو علم حدیث حاصل کرنے سے پہلے اپنی ترکیبی غلطیوں کو درست کرنے کے لئے علم النحو سیکھنے کے زیادہ محتاج ہو مطلب یہ ہے کہ ایک شاگرد کو اپنے جلیل القدر استاذ گرامی کے طرف سے علم النحو میں کمزور ہونے کی وجہ سے خوب ڈانٹ پڑی۔

امام خطیب بغدادیؒ نے حاجب بن سلیمانؒ سے نقل کیا ہے کہ میں نے وکیعؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں امام اعمشؒ کی خدمت میں سماع حدیث کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا،ایک مرتبہ میں نے حدیث پاک پڑھنے میں غلطی کی تو انہوں نے مجھے فرمایا:اے ابو سفیان (وکیع)!تو نے حدیث سے پہلے علم کو چھوڑ کر اس سے غفلت برتی ،تو میں نے کہا اے ابومحمد!علم حدیث سے پہلے کیا علم ہوسکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا النحو یعنی علم النحو، پھر پہلے انہوں نے مجھے علم النحو پڑھایا،اس کے بعد مجھے حدیث پڑھائی۔

امیر المؤمنین فی الحدیث امام شعبه بن الحجاج نے فرمایا من طلب الحدیث فلم یصر العربیة فمثله مثل رجل علیه برنس ولیس له رأس "جس نے علم حدیث کو حاصل کرنا چاہا اور نحو میں مہارت اور بصیرت ابھی تک حاصل نہیں کی ہے،تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے اپنی سر پر ٹوپی رکھ دی اور اس کا سر ہی نہ ہو"یعنی جیسی ٹوپی رکھنے کے لئے پہلے سر ضروری ہے،اسی طرح علم حدیث سے پہلے علم النحو سے واقفیت از حد ضروری ہے،حماد بن سلمہ نے فرمایا مثل الذی یطلب الحدیث ولا یعرف النحو مثل الحمار علیهِ مخلاة لا شعیر فیها "جو علم النحو میں بصیرت حاصل کئے بغیر علم حدیث میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر بوری تو لدی ہو لیکن جو سے خالی ہو"۔

اسی طرح امام خطیب بغدادیؒ نے سالم قتیبہ کا قصہ ذکر کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ابن ہبیرہ الاکبر کے ہاں موجود تھا کہ باتیں ہوتی رہیں اسی اثنا میں نحوی عالم کا ذکر خیر آیا تو ابن ہبیرہ کہنے لگے اللہ تعالی کی قسم ایسے دو آدمی کبھی برابر نہیں ہو سکتے کہ ان کا دین بھی ایک ہو،حسب ونسب بھی ایک ہو، عادات واطوار میں بھی یکساں ہو لیکن ان میں سے ایک پڑھنے اور سمجھنے میں غلطیاں کرنے

والا ہو، اور دوسرا پڑھنے اور سمجھنے میں غلطی سے مبراء اور پاک ہو اور ظاہر ہے ان میں سے دنیا و آخرت میں افضل و اعلی وہ ہے جو غلطیاں نہیں کرتا، تو سالم قتیبہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اللہ تعالی امیر کو صحیح سلامت رکھے مانا کہ وہ اپنی فصاحتِ نحو میں مہارت کی فضیلت کی وجہ سے دنیا میں تو افضل ہوسکتا ہے، بھلا آخرت میں وہ کس وجہ سے فضیلت سے نوازا جائیگا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کی کتاب قرآن مجید کو غلطیوں سے پاک اسی طریقہ سے پڑھتا ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے اسے نازل فرمایا، اور اس کی بنسبت ایک دوسرا شخص جو غلطیاں کر کے تلاوت کرے گا تو اس کے نتیجے میں اس سے صادر ہونے والی لفظی، معنوی اور اعرابی غلطیوں کی وجہ سے وہ اس بات کا مرتکب ہو رہا ہے کہ کبھی کتاب اللہ میں وہ کچھ داخل کرتا ہے جو قرآن مجید میں بیان کردہ مضامین و معانی کو باہر نکال لیتا ہے سالم قتیبہ کہتے ہیں ان کی یہ بات سن کر میں نے کہا: امیر نے سچ فرمایا اور یوں یہ بات سمجھا کر ہمارے ساتھ بھلائی کی۔(۵)

علامہ محمود الطناحی مصری کیا خوب فرماتے ہیں: نحو ہر فن کا امام اور پیشوا ہے، ہر علم پر اولیت اور اقدمیت حصولی کا درجہ رکھتا ہے، لیکن افسوس! آج اس میں کوتاہی برتی جارہی ہے، اس کے قواعد میں غلطیاں کی جارہی ہیں، اور ضوابط کو مہمل چھوڑا جارہا ہے جس کی وجہ سے زبردست نقصان ہو رہا ہے، اور ظاہر ہے اس سخت غلطی کا مرتکب درجہ کمال حاصل کر سکتا ہے، نہ ہی علم و فن کی معراج پر چڑھ کر بلندی تک پہنچ سکتا ہے بلکہ ہر جگہ طعن و تشنیع اور ذلت و خواری کا نشانہ ہی بن کر رہے گا۔

یہی وجہ ہے کہ علماء متقدمین کے تراجم و احوال میں بسا اوقات یہ الفاظ مل جاتے ہیں وکان یلحن، وکان ربما یقع من اللحن جن کا حاصل یہ ہے کہ وہ فلاں بن فلاں اِعرابی و ترکیبی غلطی کرتا تھا، وہ بہت زیادہ غلطیاں کرنے والا تھا، حتی کہ علمائے تراجم نے بعض علماء کے متعلق ان کی نحو و عربیت میں کمزوری و کمی پر نصوص قائم کئے ہیں، یہی وجہ تھی کہ حضرات متقدمین اپنی اولاد اور جگر گوشوں کو اِعرابی و بنائی غلطی کرنے پر مارا بھی کرتے تھے اور اسی قسم کا واقعہ ابن عمر سے بھی مروی ہے کہ وہ اپنے لخت جگر کو اعرابی و نحوی غلطی کی وجہ سے تأدیباً مارا کرتے تھے۔(۶)

بلکہ اس امر کی اہمیت حضرات متقدمین کے ہاں اس قدر تھی کہ وہ مشکل اور سخت مواقع پر غلط و درست کو خوب ملحوظ خاطر رکھتے اور مخاطب اور خصم کے کلام کو خوب غور سے سنتے، جس کا اندازہ اس مشہور چہار دانگ عالم واقعہ سے ہوسکتا ہے جس میں امام احمد بن حنبلؒ نے مشقتیں جھیلی یعنی خلق قرآن کا مسئلہ، اسی قصہ میں راوی کہتا ہے: و اخبرنی رجل حضره انه تفقده فی هذه الأیام الثلثة وهم یناظرونه فما لحن فی کلمة مطلب یہ کہ تین دن مسلسل میں امام احمد بن حنبلؒ کی نحوی و اِعرابی غلطی پکڑنے کی کوشش میں تھا لیکن کامیاب نہ ہوسکا و آخر دعوانا ان الحمد للّٰه رب العالمین۔

مصادر و مراجع

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۵۴۵ (۲) التوبة: ۳ (۳) صیحة فی سبییل العربیة للدکتور الطناحی، ص: ۱۸٤، ناشر: اروِقه، أردن (۴) مجالس ثعلب ص ۳۱۰ (۵) الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع ج ۲ ص ۲۶، ۲۷ (۶) الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع ج ۲ ص ۲۸، ۲۹، و ایضاح الوقف والابتداء ص ۲۴، بهجة المجالس ج ۱ ص ۲٤

مفتی ثناء اللہ رحمانی
دارالعلوم رحمانیہ مردان

گستاخ رسول کی توبہ کے بارے میں
متقدمین ومتاخرین احناف کے اقوال کا محاکمہ

گستاخ رسول کی موضوع پر لکھی گئی کتب میں قاضی عیاضؒ کی الشفاء، علامہ ابن تیمیہؒ کی الصارم المسلول کی رو سے گستاخ کی سزا صرف قتل ہے، یہی رائے متاخرین حضراتِ حنفیہ اور بعض حضراتِ شافعیہ کی بھی ہے، جب کہ متقدمین حضراتِ حنفیہ جن میں امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام طحاویؒ اور اسی طرح امام سغدیؒ اور دیگر حضرات کے نزدیک گستاخِ رسول سب وشتم سے کافر ہو جاتا ہے اور ایسا شخص اگر ذمی ہے تو اس کو ہر قسم کی سزا دینے میں حاکم وقت کو اختیار حاصل ہے، جب کہ مسلمان گستاخی کرنے سے مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کے بارے میں راجح مسلک یہی ہے کہ اس سے توبہ طلبی کی جانی چاہیے، علامہ ابن عابدین شامی کی کتاب تنبیہ الولاۃ والحکام کا یہی خلاصہ ہے، عصر حاضر میں گستاخ رسول کے حوالے سے متعدد حلقوں میں آئین پاکستان میں موجودہ امتناع توہین رسالت ایکٹ کی ترمیم کرانے پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اسی سے متعلق حضراتِ احناف کے آراء نقل کر کے ان میں محاکمہ کی کوشش قارئین کے لیے پیش خدمت ہے۔

اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ گستاخِ رسول کی سزا جمہور فقہائے کرام کے نزدیک قتل ہے، لیکن کیا قتل سے پہلے اس کا توبہ قابل قبول ہے یا نہیں؟ اس بارے میں فقہائے احناف کے آراء مختلف ہیں، متقدمین حضراتِ حنفیہ گستاخ رسول کا توبہ قبول کرنے کے قائل ہیں، جب کہ متاخرین حضرات قبولیت توبہ سے انکار کرتے ہیں، عصر حاضر میں یہ موضوع زیادہ زیر بحث ہیں کہ کیا گستاخ رسول کا توبہ قبول ہے؟ جیسا کہ متقدمین حضراتِ حنفیہ کی رائے ہیں، یا پھر متاخرین کی رائے کے مطابق ان کا توبہ بالکل قبول نہیں اور اس جرم کی سزا صرف قتل ہے۔

گستاخِ رسول کی سزا کے بارے میں حضرات احناف کے اقوال:

حضراتِ احناف کے مذہب کا حاصل دو اقوال ہیں: پہلا قول: گستاخ رسول کے بارے میں متقدمین قبولیتِ توبہ کے قائل ہیں، دوسرا قول: گستاخِ رسول کو بغیر توبہ طلبی کے قتل کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ حضرات فقہائے حنفیہ نے گستاخ رسول کے بحث کو مستقل باب کی شکل میں ذکر نہیں کیا، بلکہ مسلمان گستاخ رسول کے احکام کتاب الردۃ میں، حربی گستاخ کے احکام کتاب السیر میں، جب کہ ذمی گستاخ کے احکام نقضِ عہد کے ابواب میں نقل کیے ہیں، اس انداز تحریر سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ احناف کے نزدیک گستاخ رسول کا حکم مرتد کی طرح ہے، لہٰذا اس پر مرتد کے احکام لاگو ہوں گے، علامہ تقی الدین السبکیؒ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

شوافع اور احناف گستاخی کے مسئلے کو مستقل زیر بحث نہیں لاتے، بلکہ اسے باب الردا اور نقض عہد کے ضمن میں ذکر کرتے ہیں(۱) کتب احناف اور کتب شوافع گستاخ رسول کا توبہ بغیر استثناء قبول کرتے ہیں، جب کہ مالکیہ اور حنابلہ چند صورتوں میں مرتد کا توبہ قضاءً قبول نہیں کرتے: پہلی صورت: متعدد بار ارتداد کرنے والا دوسری صورت: زندیق تیسری صورت: گستاخ رسالت جب کہ شوافع اور حنفیہ زندیق کے علاوہ تمام مرتدین کا توبہ قبول کرتے ہیں(۲)

گستاخ رسول کے بارے میں فقہائے احناف کی رائے

☆ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالی سے یہ تصریح منقول ہے کہ گستاخ رسالت اگر توبہ تائب ہوجائے، تو تعزیر دینے کے بعد اس کا توبہ قبول کیا جائے گا(۳)

☆ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان مردشان رسالت میں گستاخی کریں یا پھر برا بھلا کہہ کر توہین آمیز کلمات استعمال کریں، تو یہ شخص کافر ہے، اس کی بیوی بائنہ ہوگئی، اگر توبہ کریں، تو ٹھیک وگرنہ پھر اسے قتل کردیا جائے گا(۴)

☆ امام محمد رحمہ اللہ نے الجامع الصغیر میں لکھا ہے کہ آزاد اور غلام مرتد مرد پر پہلے اسلام پیش کیا جائے گا اور انکار کی صورت میں قتل کردیا جائے گا، جب کہ مرتدہ عورت کے مسلمان ہونے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کی جائے گی، لیکن اسے قتل نہیں کیا جاسکتا(۵)

☆ امام ابوالحسن الکرخی رحمہ اللہ نے مرتد کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے ہر حال میں توبہ طلبی کرنی چاہیے(۶)

☆ علامہ سغدی رحمہ اللہ نے گستاخ رسول کے بارے میں لکھا ہے کہ شان رسالت میں توہین کرنے والا مرتد ہے، اس کا وہی حکم ہے، جو دوسرے مرتدین کا ہے(۷)

☆ علامہ خیر الدین رملی رحمہ اللہ نے گستاخ رسول کو مرتد قرار دے کر اس حکم کو فقہ حنفی کا عام مسلک کہا ہے(۸)

☆ علامہ سید احمد حموی رحمہ اللہ نے گستاخ رسول کے بارے میں علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کی رائے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی اس رائے پر معاصرین علماء نے بھی خوب تنقید کی، چونکہ یہ رائے قاضی عیاضؒ سے منقول ہے، جو کہ مسلکاً مالکی ہے، گستاخ رسول کا حکم اگر فقہ حنفی کی رو سے دیکھا جائے، تو اس کا توبہ قابل قبول ہونا چاہیے(۹)

☆ علامہ حسام الدین چلپی رحمہ اللہ نے گستاخ رسول کے بارے میں امام بزازی کی تنقید پر ایک رسالہ تحریر کیا ہے، جس میں کتب

احناف کی روشنی میں گستاخ رسول کی قبولیت توبہ کو دلائل سے ثابت کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ توبہ قبول نہ کرنے کی رائے حضرات احناف میں امام بزازی کے علاوہ کسی اور کا نہیں (۱۰)

☆ علامہ تمرتاشیؒ نے شیخ الاسلام ابن عبدالعالؒ سے گستاخ رسول کے بارے میں علامہ ابن الہمام اور امام بزازیؒ کی اس رائے کی حقیقت نقل کی ہے کہ درحقیقت یہ رائے ان دونوں حضرات نے علامہ ابن تیمیہؒ کی الصارم المسلول سے نقل کی ہے، جب کہ اس رائے کو نقل کر کے ان دونوں حضرات نے الصارم المسلول کے علاوہ فقہ حنفی کی کسی کتاب کا حوالہ پیش نہیں کیا، جب کہ فقہ حنفی کے اکثر کتب میں گستاخ رسول کو مرتد کہا ہے، جس میں النتف فی الفتاوی، معین الحکام، شرح الطحاوی، حاوی الزاھدی اور دوسری کتب شامل ہیں، جس میں احناف کے مذہب پر گستاخ رسول کی توبہ کو قبول کیا ہے (۱۱)

☆ شیخ المشائخ علامہ رحمتی رحمہ اللہ نے گستاخ رسول کے بارے میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا مذہب احناف کی طرح نقل کیا ہے کہ اس کا توبہ قبول کیا جائے گا، اگرچہ امام مالکؒ سے یہ روایت قوی نہیں، جب کہ امام شافعیؒ کا راجح مسلک وہی ہے، جو حضرات احناف کا ہے اور حضرات احناف گستاخ رسول کو مرتد کہتے ہیں، لہٰذا مفتی کو چاہیے کہ احکام بیان کرنے میں دقت نظر اور بصیرت سے کام لے کر ہر غیر مانوس قول سے احتراز کرنا چاہیے (۱۲)

☆ ابن افلاطون زادہ رحمہ اللہ نے شرح الطحاوی کے حوالے سے بھی گستاخ رسول کو حکماً مرتد قرار دیا ہے (۱۳)

☆ شیخ المشائخ علامہ سائحانی رحمہ اللہ سے علامہ ابن عابدینؒ گستاخ رسول کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ میرے ذہن میں یہ بات نہیں آتی، کہ کیوں علامہ تمرتاشیؒ نے شیخ الاسلام علامہ ابن عبدالعال سے گستاخ رسول کے بارے میں یہ رائے سنی اور پھر بھی ان نقل کے خلاف اپنے کتاب کے متن میں گستاخ رسول کے قبولیت توبہ سے انکار کیا (۱۴)

☆ علامہ مصطفیٰ بن محمد الطائی (۱۱۹۲ھ) نے لکھا ہے کہ اگر شاتم رسول کی گستاخی علی الاعلان ببانگ دہل ہو یا گستاخی کا عادی ہو، تو پھر اس کی سزا صرف قتل ہے (۱۵)

☆ علامہ ابن کمال باشاؒ نے لکھا ہے کہ اگر گستاخ رسول علی الاعلان گستاخی کرے، تو اس کی سزا صرف قتل ہے (۱۶)

☆ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے آخر میں بطور فیصلہ لکھا ہے کہ گستاخ رسول کا توبہ قبول نہ کرنے کے بارے میں حضرات احناف کے مستند متون وشروح، فتاوی اور کتب شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کے نقول سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ حنفیہ کا مسلک نہیں۔

گستاخ رسول کے بارے میں حضرات فقہائے احناف کی دوسری رائے:

متاخرین حضرات حنفیہ گستاخ کی قبولیت توبہ کے بارے میں قدرے تفصیل سے کام لیتے ہیں:

☆ اللہ رب العزت کے حضور میں گستاخانہ کلمات استعمال کرنے والوں کے بارے میں ان کی رائے متقدمین حضرات کی طرح ان کا توبہ قبول کرتے ہیں، جب کہ شان رسالت میں گستاخی کرنے والوں کی سزا بطور حد صرف قتل تجویز کر کے ان کا توبہ قبول نہیں کرتے، ان حضرات میں علامہ بزازی کردریؒ، محقق ابن الہمامؒ، صاحب خلاصۃ الفتاویٰؒ، ملاخسروؒ، ابن نجیمؒ، شیخی زادہؒ، علامہ عینیؒ، علامہ حصکفیؒ، محمد بن عبدالقادر السندیؒ، محقق عبدالرحمٰن صاحب مجمع الانہر، علامہ ابوالسعود الرومی، علامہ مصطفیٰ بن محمد الطائیؒ، قاضی عبدالواحد السیوستانی السندی صاحب الفتاوی الواحدی، علامہ احمد طحطاویؒ، علامہ انور شاہ کاشمیریؒ اور علامہ ظفر احمد عثمانیؒ شامل ہیں۔

گستاخ رسول کے بارے میں علامہ بزازی رحمہ اللہ کی دلیل

اس بارے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ شان رسالت کی گستاخی کرنا حقوق العباد میں داخل ہے، جو توبہ کرنے سے بھی ساقط نہیں ہوتا، جس طرح حد قذف توبہ کرنے سے ختم نہیں ہوتا، اسی طرح گستاخی پر بھی توبہ مانگنے سے حد ساقط نہیں ہوتا(۱۷)

گستاخ رسول کے بارے صاحب خلاصۃ الفتاوی (۵۴۲ھ) کی رائے

علامہ طاہر بن عبدالرشید البخاریؒ نے گستاخ رسول اور گستاخ خدا میں فرق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گستاخِ خدا کی توبہ قبول ہے، مگر گستاخ رسول کی توبہ قبول نہیں(۱۸)

گستاخ رسول کے بارے میں محقق ابن الہمام رحمہ اللہ کی دلیل

اپنے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنے والا مرتد ہے، تو برا بھلا کہنے کی صورت میں بطریقہ اولیٰ ارتداد ثابت ہوگا، لیکن اس ارتداد پر مرتب ہونے والی سزا حد ارتداد کی طرح نہیں، کیونکہ اس میں توبہ کرنے سے بھی حد ساقط نہیں ہوتا(۱۹)

گستاخ رسول کے بارے میں ملاخسرو رحمہ اللہ کی دلیل

الدرر والغرر میں ملاخسروؒ نے اپنے پیشرو دونوں محققین حضرات، علامہ بزازیؒ اور علامہ ابن الہمامؒ کے دلائل کو جمع کر کے ارتداد کی چند قسمیں بیان کی ہیں: ☆ اگر کوئی مسلمان ضروریاتِ دین کا انکار کرنے سے مرتد ہو جاتا ہے اور حق الغیر نہ ہونے کی وجہ ارتداد ایک انفرادی علت ہے، لہٰذا اس میں توبہ قبول ہو جانا چاہیے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی حضور میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرنے والا مسلمان مرتد ہو جاتا ہے اور اگر توبہ تائب ہو جائے، تو مرتد کی طرح اس کا توبہ بھی قابل قبول ہے۔

☆ دین کی گستاخی اور دوسرے کفریات کا ارتکاب کر کے اسلام کا دعوی کرنے والا زندیق ہے، ایسا آدمی اگر شان رسالت میں گستاخی کریں، تو اس کی توبہ بالکل قابل قبول نہیں، بلکہ اسے ہر حال میں قتل کر دیا جائے گا۔

☆ اگر کوئی مسلمان شانِ رسالت میں گستاخی کریں، تو گرفتاری سے پہلے اور بعد دونوں حالتوں میں اس کا توبہ قابل قبول نہیں، کیونکہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے حدود توبہ تائب ہونے سے ساقط نہیں ہوتے، جیسے حد قذف توبہ سے ساقط نہیں ہوتا، جہاں تک شان خداوندی میں زبان درازی کرنے والے کا تعلق ہے، تو چونکہ باری تعالی تمام عیوب سے منزہ اور پاک ہے، جب کہ شان رسالت میں توہین کرنا ایک نوع انسان پر تہمت لگانا ہے، کیونکہ انبیاء کرام انسان و بشر ہیں اور بنی نوع انسان کسی برائی سے منزہ نہیں، لیکن انبیاء کرام کو اللہ تعالی نے بطور اکرام و اعزاز تمام خرابیوں سے پاک پیدا کیے ہیں، اس وجہ سے گستاخ رسول کی سزا بطور حد قتل ہے (۲۰)

گستاخ رسول کے بارے میں علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کی دلیل

علامہ بزازیؒ اور محقق ابن الہمامؒ کے دلائل کی روشنی میں علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے گستاخی رسالت کی وجہ سے ہونے والے ارتداد کی سزا صرف قتل تجویز کر کے لکھا ہے کہ دنیا میں ہر کافر کی توبہ قبول ہے، لیکن ان کفار کا توبہ بالکل قابل قبول نہیں، جو شان رسالت میں گستاخی کا ارتکاب کریں (۲۱)

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کے بھائی صاحب النہر الفائق (۱۰۰۵ھ) کی رائے

عمر ابن نجیمؒ کنز الدقائق کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اگر مرتد دوبارہ اسلام قبول کریں، تو عام طور پر حد ارتداد کی سزا اس سے ساقط ہوتی ہے، لیکن اس ضابطے سے گستاخ رسول مستثنیٰ ہے، کیونکہ اس کی توبہ کرنے کے بعد بھی حد ارتداد ساقط نہیں، بلکہ گستاخی کے بعد اس کے لیے سزائے موت برقرار رہے گی (۲۲)

صاحب مجمع الانہر کی رائے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دوسرے پیغمبر کی شان میں گستاخی کرنے والے کا توبہ قبول نہیں اور اسے بطور حد قتل کیا جائے گا، اگرچہ حالت نشہ میں کیوں نہ ہو (۲۳)

محقق ابو السعود رومی (۱۱۷۲ھ) کی رائے

مفتی بہ قول یہی ہے گستاخ رسول کی سزا قتل ہے اور اس کا توبہ قبول نہیں (۲۴)

علامہ محمد بن عبد القادر سندیؒ (۱۱۴۹ھ) کی رائے

علامہ سندی الدر المختار کی شرح قرۃ الأنظار میں لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دلی بغض رکھنے والا مرتد شمار ہوتا ہے، تو گستاخ رسول بطریق اولیٰ مرتد ہوگا اور اس کی سزا بطور حد قتل کرنا ہے اور اس دوران توبہ کرنا قابل قبول نہیں (۲۵)

گستاخ رسول کے بارے میں علامہ شیخی زادہؒ کی دلیل

علامہ شیخی زادہؒ نے گستاخ رسول کی دو قسمیں لکھی ہیں: ☆ اگر کوئی شخص شان رسالت میں گستاخی کا ارتکاب کریں، لیکن یہ کھلم کھلا نہ ہو، یا ایک بار غلطی سے یہ الفاظ سرزد ہو جائے، تو ایسے گستاخ کا توبہ مرتد کی طرح قبول ہونا چاہیے ☆ اگر کوئی شخص شان رسالت میں کھلم کھلا توہین آمیز الفاظ کہے یا کھلم کھلا تو نہ کہے، لیکن بار بار ایسے الفاظ سرزد ہو جائے، تو ایسے بدبخت کے بارے آج کل یہی قتل کا فتوی دینا چاہیے، جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جو عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بار بار گستاخی کرتی رہتی تھی، تو اسے قتل کر دیا گیا۔

گستاخ رسول کے بارے میں علامہ میدزادہ رحمہ اللہ کی دلیل

فتاویٰ میدزادہ میں قاضی عیاض کی کتاب الشفاء سے نقل کیا گیا ہے کہ ذمی گستاخ رسول کو اگر امام آگ سے جلانے کی سزا دینا چاہیے، تو یہ سزا دے سکتا ہے، لیکن توبہ کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے قتل کی سزا ساقط نہیں ہو سکتی (۲۶)

قاضی عبدالواحد سیوستانی سندیؒ (۱۲۲۴ھ) کی رائے

گستاخ رسول ذمی کے بارے میں مفتیٰ بہ رائے حضرات فقہائے احناف نے یہی لکھی ہے کہ اسے قتل کیا جائے، یہی رائے علامہ رملیؒ، علامہ عینیؒ اور دوسرے حضرات حنفیہ کی بھی ہے (۲۷)

علامہ محمد العباسی صاحب الفتاوی المهدیه (۱۳۱۵ھ) کی رائے

ابن عابدینؒ کی رائے پر فتوی دیتے ہوئے علامہ مہدی اپنے مشہور فتاوی الفتاویٰ المهدية فی الوقائع المصریه میں لکھتے ہیں کہ احتیاط اسی میں ہے کہ اگر گستاخِ رسول تقویٰ وطہارت اور اعمالِ صالحہ سے اپنی توبہ کو مزین کرے، تو اس کی توبہ قبول کرنی چاہیے (۲۸)

حضرات متقدمین ومتاخرین احناف کے نقول میں تطبیق

☆ امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نصوص میں گستاخ رسول کی توبہ کی تصریح منقول ہے، جس کی وجہ سے قبولیت توبہ کا قول درست معلوم ہوتا ہے۔

☆ متاخرین حضرات حنفیہ میں محقق ابن الہمام کے بارے میں ان کے شاگرد علامہ قاسم ابن قطلو بغاؒ کا یہ قول مشہور ہے کہ ہمارے شیخ ابن الہمامؒ کے تفردات اگر فقہ حنفی کے ساتھ متعارض آ جائے، تو ان سے صرف نظر کر کے انہیں اصل مذہب کے مقابلے میں اعتبار نہ دیا جائے، فتح القدیر میں علامہ ابن الہمامؒ نے احکام المرتدین میں صاحب ہدایہ کی عبارت نقل کر کے لکھا ہے کہ ہر وہ شخص جو دل میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھے، تو وہ کافر ہے، لہذا برا بھلا کہنا بطریق اولیٰ کفر ہوا، لیکن ان دونوں مرتدین کے درمیان فرق یہ ہے کہ عام مرتد توبہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے، جب کہ گستاخی کرنے والا توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا(۲۹) اس عبارت کا حوالہ محقق رحمہ اللہ نے کتب احناف سے کوئی دلیل ذکر نہیں کی، لہٰذا ان کے شاگرد علامہ قاسمؒ کے بقول یہ تشریح فقہ حنفی سے تفرد شمار کرنا چاہیے۔

☆ علامہ ابن الہمامؒ کے زیر اثر علامہ ابن نجیمؒ نے بھی فتح القدیر اور فتاوی بزازیہ کے دلائل کو نقل کر کے البحر الرائق میں علامہ نسفیؒ کے مرتد کی قبولیت توبہ سے گستاخ رسول کے مسئلے کو مستثنیٰ کیا اور اس کی سزا صرف قتل تجویز کی (۳۰)

علامہ سید احمد الحمویؒ نے ابن نجیمؒ کی اس رائے پر معاصرین اور ان کے بھائی ابن نجیم الصغیر وغیرہ حضرات کے رد و نقل کیے ہیں ان میں شیخ الاسلام امین الدین بن عبدالعالؒ اور برہمتویؒ شامل ہیں (۳۱)

☆ گستاخ رسول کی توبہ قبول نہ کرنے کی یہ رائے متاخرین حضرات حنفیہ میں اس تسلسل سے جاری رہی کہ علامہ حصکفیؒ نے شیخی زادہ سے یہ رائے نقل کی، انہوں نے ابن نجیمؒ سے اور علامہ ابن نجیمؒ نے ابن الہمامؒ سے، جب کہ علامہ بزازی کردریؒ اور بزازیؒ نے ابن تیمیہؒ کی الصارم المسلول کا حوالہ دے کر حنابلہ کی یہ رائے اپنے فتاوی الجامع الوجیز میں نقل کی ہے۔

گستاخ رسول کے بارے میں احناف کا مسلک کتب مذاہب اربعہ میں

قاضی عیاضؒ نے الشفاء میں ائمہ ثلاثہ کا مسلک نقل کرنے کے بعد اہل کوفہ، امام اوزاعیؒ، امام ثوریؒ، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے قبولیت توبہ بیان کی ہے اور گستاخی کو ارتداد شمار کیا ہے (۳۲) علامہ ابن تیمیہؒ نے الصارم المسلول میں لکھا ہے کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے مشہور مذہب کے مطابق گستاخ رسول کا توبہ قبول نہیں کیا جائے گا، جب کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مشہور قول کی رو سے گستاخ رسول کا توبہ قبول کیا جائے گا (۳۳) علامہ سبکیؒ نے دیگر مسالک کی آراء نقل کر کے حضرات حنفیہ کی طرف صرف قبولیت توبہ کی رائے منسوب کی ہے (۳۴)

☆ گستاخ رسول کے بارے میں حضرات حنفیہ کی یہ رائے امام سبکیؒ، ابن تیمیہؒ اور قاضی عیاض کے کلام سے بھی ثابت ہوتی ہے، جب کہ قاضی عیاضؒ کی تصریحات کی روشنی میں دوسرے مسالک میں تو توبہ قبول کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں مختلف آراء موجود ہیں، لیکن احناف کا متفقہ مسلک قبولیت توبہ ہے۔

☆ حضرات حنفیہ مرتد کے احکام میں پہلے تخفیف سے کام لے کر مرتدہ کے قتل کے بالکل قائل نہیں، جب کہ بار بار مرتدہ ہونے والی عورت کی توبہ کو بھی قبول کرتے ہیں، اسی طرح ذمی گستاخ کے بارے میں نقض عہد کے بھی قائل نہیں۔

مزید برآں اہل کتاب، اللہ تعالی کے لیے بیٹا اور بیوی وغیرہ شرکیات ثابت کرتے ہیں، بالفاظ دیگر گستاخی خداوندی کے مرتکب ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کا عہد ذمہ نہیں ٹوٹتا (۳۵) یہی وجہ ہے کہ گستاخ خدا اور گستاخ رسول میں حضرات حنفیہ کے نزدیک کوئی فرق نہیں

ہے، بلکہ دونوں پر مرتد کے احکام جاری ہوں گے، سلطنت عثمانیہ میں اسلامی حکومت کے قاضیوں کو بادشاہِ وقت کی طرف سے ۹۴۴ھ میں ایک خط جاری ہوا، جس میں دونوں آراء کو جمع کر کے یہ حکم نامہ تیار کیا گیا کہ گستاخِ رسول اگر توبہ تائب ہو کر دوبارہ اسلام قبول کرے اور اپنے اعمال کی درستگی کرے، تو امام ابوحنیفہؒ اور دیگر متقدمین حضرات حنفیہ کی رائے پر عمل کر کے اس کی توبہ قبول کی جائے اور اگر گستاخ کا کردار درست نہ ہو، تو ائمہ ثلاثہ کے قول پر عمل کر کے اسے قتل کر دیا جائے (۳۶)

حرفِ چند گستاخ رسول کے مسئلے میں متقدمین حضراتِ احناف کی رائے پر اصرار کیوں؟

مذکورہ بالا وجوہ ترجیح کی روشنی میں گستاخ رسول کا توبہ حضرات حنفیہ کی رائے میں چند شرائط کے ساتھ قبول ہونا چاہیے، جس کی مفصل وضاحت آئندہ سطور میں ذکر کی جائے گی، ایک طرف متقدمینِ احناف کی روایات ہیں، جن کی روشنی میں گستاخِ رسول کی سزا صرف قتل نہیں، بلکہ قتل سے پہلے عام مرتد کی طرح تین دن تک مہلت دیکر توبہ طلبی کرنا ہے اگر وہ دوبارہ اسلام قبول کرنا چاہے، تو اس کا اسلام قابل قبول تصور کیا جائے اور اس کا توبہ درست تسلیم کر کے اس کو دوسرے عام شہریوں کی طرح حقوق دیئے جائیں، تاہم اس کے گذشتہ سارے نیک اعمال اکارت ہو کر ضائع ہو چکے ہیں، اسی طرح اس کو تجدیدِ اسلام کے ساتھ تجدیدِ نکاح بھی کرنی ضروری ہے، جبکہ متاخرین فقہائے احناف نے گستاخ رسول کو دوسرے عام مرتدین کی طرح شمار نہیں کیا، بلکہ ان احادیثِ مبارکہ سے استدلال کیا، جن میں گستاخِ رسول کی سزا صرف قتل تجویز کی گئی ہے، جب کہ توبہ طلبی وغیرہ امور کو مرتد کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک کتاب بنام تنبیه الولاة والحكام على أحكام شاتم خير الأنام لکھی، جس میں متعدد بار یا برسرِ عام گستاخی رسول کے مرتکب کی سزا قتل تجویز کی، جب کہ جہالت یا دوسرے نامعلوم وجوہات بنا پر ایک بار گستاخی کے مرتکب کی سزا قید بامشقت ذکر فرمائی ہے اور توبہ نہ کرنے پر عام مرتد کی طرح توبہ طلبی کے بعد قتل کا حکم تحریر فرمایا ہے۔

برصغیر میں جناب غامدی صاحب اور ان کے ہم نوا لوگوں کا خیال ہے کہ گستاخ رسول کی سزا صرف قتل تجویز کرنا درحقیقت فقہ حنفی سے عدول کرنے کے مترادف ہے، لہٰذا پاکستان کے آئین میں گستاخی رسول کی سزا جو قتل تجویز کر دی گئی ہے، وہ مبنی بر انصاف نہیں، کیونکہ یہ سزا دراصل ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے موافق ہے، اور اس آئین کے تبدیلی کے لیے حکومتی سطح پر اپنے حلقہ اثر لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالنے کی بار بار کوشش کی جاتی ہے کہ اس آئین کو تبدیل کیا جائے اور فقہ حنفی کے موافق عام مرتد کی سزا لاگو کی جائے، ہمارے بعض علمی حلقوں سے بھی یہ صدائے بازگشت چلی آ رہی ہے کہ گستاخِ رسول کی سزا صرف قتل نہیں اور اس کے لیے فقہائے احناف کی وہ رائے نقل کی جاتی ہے، جس میں گستاخِ رسول کا حکم عام مرتد کی طرح رکھا گیا اور دونوں کی سزا ایک توبہ طلبی بیان کی جا رہی ہے اور اپنے فتوؤں میں اسے احناف کا مسلک شمار کیا جاتا ہے، لیکن یہ ساری آراء چند وجوہ سے محلِ نظر ہیں:

پہلی وجہ: دوسرے مذاہب کے برعکس اس مسئلے میں حضرات حنفیہ کا مسلک یہی ہے کہ مسلمان یا غیر مسلم گستاخِ رسول اس وقت مرتد کے

حکم میں ہے، جب ایک بار غلطی یا جہل سے گستاخی کا ارتکاب کرے یا نجی مجلس میں یہ عمل سرزد ہوا اور اگر متعدد بار یا برسرِ عام لوگوں کے سامنے یا نجی مجلس میں کئی مرتبہ اس جرم کا ارتکاب کیا جائے، تب وہ شخص صرف مرتد نہیں، بلکہ زندیق ہے، جس کی سزا صرف قتل ہی متعین ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوئی، کہ متقدمین حضراتِ فقہائے احناف نے جس گستاخِ رسول کو مرتد کے حکم میں شمار کیا ہے، اس سے مراد وہ مرتد ہے، جو ایک بار گستاخی کا ارتکاب کرے، یا کسی نجی مجلس میں یہ عمل سرزد ہو، لیکن اگر اس کے برعکس معاملہ ہو، جیسا کہ عصر حاضر کے گستاخوں کی صورت حال ہے، تو اس میں حضرات متقدمین احناف کا مسلک بھی صرف قتل ہی کا ہے، یہ حکم ہرگز نہیں، حضرات احناف نے اس کا حکم تو نہیں فرمایا، تاہم متاخرینِ حضراتِ احناف نے ایسے کو زندیق کے درجے میں رکھ کر اس کے لیے قتل بطور سزا مقرر فرما کر ان احادیثِ مبارکہ سے استدلال کیا، جن میں گستاخ رسول کے قتل کا حکم دیا گیا، لہٰذا یہ بات کرنا کہ گستاخِ رسول کے بارے میں متاخرین حضراتِ احناف نے متقدمین حضراتِ حنفیہ کی رائے نہیں سمجھی، یہ بات بالکل درست نہیں۔

بلکہ متقدمین کا یہ حکم کلمہ کفر کے بارے میں تھا، چاہے شانِ خداوندی میں گستاخی ہو جائے یا شانِ رسالت میں، ان کے ہاں دونوں کے بارے میں حکم ایک تھا، کیونکہ اس زمانے میں مسلمان سے توہین خدا یا رسول ممکن نہ تھی اور ذمی کا حکم ذکر کر دیا، یہی وجہ ہے کہ ان کے کتب میں مسلمان گستاخِ رسول کا حکم باب الارتداد میں ملتا ہے اور ذمی گستاخِ رسول کا حکم باب الجزیۃ میں، شاید اس کے علاوہ بھی کچھ دیگر وجوہات ملحوظِ نظر ہو، لیکن جب حضراتِ متاخرین حنفیہ کے دور میں یہ معاملہ شدید ہو گیا، تو ان حضرات نے دگرگوں صورتِ حال کے پیشِ نظر باب الارتداد، باب البغاۃ اور باب الجزیۃ وغیرہ میں گستاخِ رسول کا مسئلہ مزید وضاحت سے بیان کرتے ہوئے اس کی سزا قتل تجویز فرمائی، چونکہ بعد کے زمانے میں گستاخی رسالت جہل یا کم فہمی کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ تعصب وعناد اور مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی وجہ سے یہ دھندا اختیار کیا جاتا اور اس پر عیسائی حکمرانوں کی طرف سے باقاعدہ انعامات مقرر ہوتے، جس کے لیے باقاعدہ جماعتوں کی تشکیل ہوتی تھی (۳۷)

مذکورہ بالا تطبیق دینے کے بعد بندہ ناچیز کی نظر سے علامہ سیالکوٹیؒ کی مخطوط کتاب حاشیۃ علی الدرر والغرر گذری، وہاں پر علامہ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فتح القدیر کے حوالے سے لکھا ہے: والذی تقرر عند الکمال المحقق ابن الھمام وعند بعض المتأخرین من ا ئمۃ الکرام أن سبہ علیہ السلام بما لا یعتقدہ ویتدین بہ کنسبۃ علیہ السلام إلی الزنا أو طعن فی نسبہ ینتقض بہ العھد ویقتل ولا تقبل توبتہ ولا إسلامہ فی دفع القتل وإن کان مقبولا فی نفسہ ومحکوما علیہ بإسلامہ (۳۸) اسکے بعد لکھا ہے کہ اگر کوئی کافر یا مسلمان گستاخی کرنے کے بعد تائب ہو کر اسلام قبول کریں اور حد جاری ہونے کے بعد مر جائے، تو یہ حالتِ اسلام میں مرا اور اس کا جنازہ اور کفن دفن ہوگا اور اگر بغیر توبہ کے مرے، تو نہ جنازہ ہوگا اور نہ کفن دفن ہوگی، اسی علامہ سیالکوٹیؒ نے یہ استنباط کیا ہے کہ گستاخی کی حد جاری ہوگی، لیکن یہ حد تعبدی کہلائی گی۔

فی نفسہ قبولیتِ توبہ، حد تعبدی اور حد جاری ہونے سے پہلے مرنے کی صورت میں نمازِ جنازہ، کفن اور مسلمانوں کے مقبرے میں دفن سے معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین حضرات کا یہ حکم حالات کی وجہ سے تھا، جب کہ متاخرین کے مقابلے میں آج کل کے حالات اس بات کے زیادہ متقاضی ہیں، کہ ان گستاخوں کو فی الفور سزائے موت دی جائے۔

دوسری وجہ: اگر یہ بات ثابت بھی ہوجائے کہ متقدمین حضراتِ احناف نے ہر گستاخِ رسول کو عام مرتد کے طرح قرار دیا ہے، تو کیا دوسرے حضرات حنفیہ کو اس بات کی اجازت بالکل نہیں کہ وہ متقدمین حضرات کی بات چھوڑ کر متاخرین کی رائے کو راجح قرار دے کر اور گستاخ رسول جیسے ملعون کو عام مرتد کے حکم سے نکال کر زندیق کا حکم اس پر لگائیں۔

تیسری وجہ: حالات کی وجہ سے احکامات میں تبدیلی ہوتی ہے، یعنی امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں اسلام کے عروج کا دور تھا، جسے منافقین، کفار اور زنادقہ وغیرہ دیکھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے، اس وجہ سے اس وقت گستاخِ رسول گستاخی کا ارتکاب ڈر اور خوف کی حالت میں کرتا تھا۔

شاید اس علت کو دیکھ گستاخی کو ارتداد قرار دیا گیا، لیکن بعد کے زمانے میں بالعموم اور آج کے دور میں بالخصوص جب کفر بام عروج پر پہنچ کر اسلام اور مسلمان کو جسمانی اور ذہنی غلامی میں گرفتار کر کے ان سے محبت رسول کا آخری آسرا بھی چین لینے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، ان حالات کا تقاضہ بھی صرف یہی ہے کہ گستاخی رسول کی سزا صرف قتل مقرر کی جائے۔

چوتھی وجہ: کیا متاخرین حضرات احناف نے بہت سے ایسے راجح اقوال کو مرجوح قرار نہیں دیا، جن کی ترجیح خود متقدمین حضرات احناف نے دی تھی، لیکن متاخرین نے ان راجح اقوال کو مرجوح قرار دیدیا، جنہیں آج ہر خاص و عام مسلک اور مذہب کے طور پر قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہے۔

پانچویں وجہ: اگر متاخرین حضراتِ فقہائے احناف نے اس مسئلے میں اپنے زمانے کے اعتبار سے حضرات متقدمینِ احناف کے دلائل نہ پائے ہوں اور انہوں نے دوسرے مذاہب میں سے اس حکم کو نقل کر کے اپنے مذہب کے قواعد کے خلاف نہ ہونے کی وجہ سے اسے اپنا مذہب قرار دیا ہو اور اس کے مطابق حکم صادر فرمایا ہو، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے بہت مسائل میں حضراتِ شوافع میں سے کسی مسئلہ میں کوئی جزئیہ نقل کر کے اس کو اپنا مذہب اس وجہ سے قرار دیا ہے کہ وہ قواعدِ مذہب حنفی کے خلاف نہیں اسی طرح مفقود الزوج اور دوسرے عائلی مسائل میں مذہبِ غیر پر ہمارے اکابر نے فتوی نہیں دیا؟

اسی تناظر میں کیا عصر حاضر میں بینکنگ اور دوسرے اقتصادی امور پر مذہب غیر پر فتوی نہیں دیا جاتا؟ کیا آج کے حالات یہ تقاضہ نہیں کر رہے کہ ملکی اور بین الاقوامی حالات کے تناظر میں گستاخ رسول کی سزا صرف اور صرف قتل مقرر کیا جائے۔

چھٹی وجہ: حضرات فقہاء احناف کی اصول میں ہے کہ کسی مسئلے میں حکمِ حاکم اختلاف کو ختم کر دیتا ہے۔

ساتویں وجہ: علامہ ابن عابدینؒ کے زمانے میں چونکہ سلطنتِ عثمانیہ کا دورِ عروج تھا اور سلطنتِ عثمانیہ کے سلاطین رحمہم اللہ کی طرف سے بھی یہی حکم تھا کہ اگر گستاخِ رسول توبہ کرکے اپنی حالت کی اصلاح کریں، تو اس کا توبہ قبول ہوگا اور اگر پہلے کی طرح اعمال ہو، تو اس کا توبہ قبول نہیں، مگر موجودہ دور میں مسلمان جن دگرگوں صورت حال، طوائف الملوکی اور کسمپرسی سے گزر رہے ہیں، شاید تاریخ اسلامی میں ایسا کوئی زمانہ گزرا ہو۔

لہٰذا ایسی صورت حال میں ملکی سطح پر ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بنے ہوئے قانون پر نکتہ چینی کرنا یا اسے مذہبِ حنفی کے مخالف کہنا شاید دانشمندی نہ ہو، لہٰذا اس کا تقاضہ یہی ہے جب حاکم نے قانون بنایا کہ گستاخی کی سزا اب صرف قتل ہوگی، تو کیا متقدمین اور متاخرین حضراتِ احناف میں اختلاف باقی رہ سکتا ہے؟ اب حضراتِ متاخرین کی رائے راجح ہے یا حضراتِ متقدمین کی؟ کیا اب گستاخِ رسول کی سزا قتل ہوگی؟ اس سنگین مسئلہ میں فیصلہ واضح ہے۔

مذکورہ بالا نقول کا خلاصہ اور عصر حاضر میں اس کی تطبیق

ائمہ احناف اور فقہائے متاخرین کے نقول سے جہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اپنے مسلک کے امام کے اقوال کی اتباع ضروری ہے، تاکہ نفسانی خواہشات کی اتباع لازم نہ آجائے، لیکن وہیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی کرنے والے بدبخت کو عبرت ناک سزا دینی ضروری ہے۔

اس کے لیے یہ بات ملحوظ رہے کہ گستاخی رسول اگر جہل سے سرزد ہوجائے، تو اس بارے میں اپنے مجتہد کی تشریحات کی روشنی میں ان احادیث مبارکہ پر عمل کرنا چاہیے، جن میں صحابہ کرام اور تابعین عظام نے گستاخ رسول اور گستاخ قرآن ودین کو توبہ تائب ہونے کے بعد امان دی، جیسا کہ عبداللہ بن ابی سرحؓ وغیرہ حضرات کی اسلام کو قبول کیا گیا اور اگر شانِ رسالت میں گستاخی جہل سے سرزد نہ ہو، بلکہ علی الاعلان توہین کیا ہو، یا متعدد بار کیا ہو، یا ایک بار کیا ہو مگر سرِ عام اس کی تشہیر کرکے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی کوشش کی جارہی ہو، جیسا کہ بدقسمتی سے آج کل ہمارے ہاں اور عالمی سطح پر گستاخوں کا یہی حال ہے، جنہیں سرکاری طور پر پناہ دی جاتی ہے اور یا بڑے بڑے عہدے داران کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں اور سزا سے بچانے کے لیے دن رات تگ ودو جاری رکھے ہوتے ہیں، جبکہ سرکاری طور پر متاخرین حضرات حنفیہ کے قول کے مطابق قانون بھی بنایا گیا ہے، تو ایسے گھمبیر صورت حال میں متاخرین کے قول پر عمل کرنا حالات کے تقاضے کی رو سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ اس بارے میں ائمہ مجتہدین کے اقوال، صحابہ کرام کا طرزِ عمل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یہی بتاتے ہیں کہ ایسا بدبخت صرف گستاخِ رسول نہیں، بلکہ یہ زندیق ہے، جس کا خون مباح ہے، ایسے گستاخ کے لیے اسلامی قانون کو ہاتھ میں لینے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ ہی اسے جینے کا حق دیا جائے گا۔

مصادر ومراجع

(١)السيف المسلول، ص١٧٤(٢) بدائع الصنائع، ج٧ص١٣٥(٣)ردالمحتار، ج٤ص٢٣٥ (٤) الخراج ، ص١٩٩(٥) الجامع الصغير وشرحه النافع الكبير، ص٣٠٦(٦)تبيين الحقائق، ج ٣ص ٢٨٤(٧) اس بارے میں ابن عابدین فرماتے ہیں: (فقوله) ويفعل به ما يفعل بالمرتد ظاهر فى قبول توبته كما لا يخفى النتف فى الفتاوى للسغدى، ج٢ص٦٩٤ (٨) منحة الخالق ، ج٥ ص١٣٥ (٩)منحة الخالق، ج٤ ص٢٣٤ (١٠)حاشية ابن عابدين، ج٤ص٢٣٥(١١)منحة الخالق، ج٤ ص٢٣٤(١٢)رد المحتار، ج٤ص ٢٣٣، ٢٣٥ (١٣)ايضاً(١٤)منحة الخالق، ج٥ ص١٣٥(١٥)رد المحتار، ج٣ ص٢٣٤(١٦)كنز البيان مختصر توفيق الرحمن، كتاب السير، باب العشر والخراج والجزية، فصل فى أحكام الجزية، ص٢١٠(١٧)مجموعه رسائل لابن كمال باشا، رسال: الأربعون فى الحديث، لوحة:٣٨ /ب(١٨) منحة الخالق، ج٥ ص١٣٥(١٩)خلاصة الفتاوى، كتاب ألفاظ الكفر، الجنس الثالث: فيما يقال فى الأنبيا، ج٤ص٣٨٦(١) فتح القدير، ج٦ص٩٨(٢٠) دررالحكام شرح غرر اللأحكام، ج١ص ٣٣٠، ٢٩٩(٢١) الأشباه والنظائر، ص١٥٨(٢٢)النهر الفائق، كتاب الجهاد، باب المرتد، ج٣ص٢٥٣(٢٣)مجمع الأنهرفى شرح ملتقى الأبحر، كتاب السير والجهاد، باب العشر والخراج، فصل فى أحكام الجزية،ج٢ص٣٨٢(٢٤)فتح الله المعين على شرح الكنز لملا مسكين، كتاب السير، باب المرتدين، ج٢ ص٤٦٠(٢٥)قرة الأنظار حاشية الدر المختار، كتاب الحدود، باب العشر والخراج، فصل: فى الجزية، الورقة:٩٩(٢٦)مجمع الأنهر فى شرح ملتقى الأبحر، ج١ ص٦٧٧ ،٦٧٦(٢٧)الفتاوى الواحداى،٢ /٢/الورقة:٩٢(٢٨)الفتاوىٰ المهدية فى الوقائع المصرية، باب التعزير والردة، ج٢ص١٤٧(٢٩)فتح القدير، باب أحكام المرتدين، ج٩٨(٣٠)البحر الرائق شرح كنز الدقائق ومنحة الخالق، ج٥ ص١٣٥ (٣١) غمز عيون البصائر فى شرح الأشباه والنظائر، باب الردة، ج٢ص١٩١(٣٢)الشفا بتعريف حقوق المصطفٰى،ج٢ص٢١٥ (٣٣)الصارم المسلول على شاتم الرسول، ص٣١٣ (٣٤)السيف المسلول، ص١٧٤(٣٥) علامہ شرنبلالی فرماتے ہیں: عللوا ذلك بأنه كفر والكفر المقارن له لا يمنعه فالطارئ لا يرفعه، ورد عليهم الجمهور بأن عقد الذمة خلف عن الإيمان فى إفادة الأمان فما ينقض الأصل الأقوى ينقض الخلف الأدنى بطريق الأولى .درر الحكام شرح غرر الأحكام، ج١ص ٢٩٩(٣٦)رد المحتار، ج٤ص ٢٣٢(٣٧) حاشية عبدالحكيم سيالكوٹى على الدرر والغرر لملا خسرو، كتاب الجهاد، باب الجزية، ص٢٠١(٣٨) اس بات کی دلیل (تاریخ ہسپانیہ، ج ا ص ۲۰۰) میں ہے کہ نویں صدی کے وسط میں اندلس کے اندر شاتمینِ رسول نے ایک جماعت کی شکل اختیار کر لی تھی، لیکن مسلمان قاضیوں نے نرمی نہیں برتی اور اس واقعہ ملوث ہر مجرم کو سزائے موت دی۔ یولوجیس نامی عیسائی اس گروہ کا سربراہ تھا اور اس کی سزائے موت کے ساتھ ہی مسلم ہسپانیہ میں اس بدبخت جماعت کا خاتمہ ہوا۔ بحوالہ: جرم توہین رسالت چند پہلو، شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالی رحمة واسعة

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
محقق و مفکر کراچی

ٹرمپ کی کامیابی اور اسلامی انقلابی جماعتوں کا لائحہ عمل

ٹرمپ کی غیر متوقع کامیابی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ اسلامی جماعتیں انقلابی جمہوری عمل کی نوعیت اور سرمایہ دارانہ نظام میں اس کی حیثیت اور فعالیت پر از سرنو غور کریں، اس مضمون میں چند سوالات اٹھا کر میں ان امور کی نشاندہی کرونگا جن پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے، ابتداً انقلاب سرمایہ داری اور جمہوریت کا جو مفہوم میں سمجھا ہوں وہ بیان کرونگا، اس کے بعد ٹرمپ کی کامیابی کے اسباب پر غور کر کے اس بات کا جواز پیش کرنے کی کوشش کرونگا کہ ٹرمپ کی کامیابی کو کیوں ایک انقلاب کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں، اس بحث کے تناظر میں اسلامی انقلابی جماعتوں کی جمہوری جدوجہد کے ضمن میں چند گزارشات پیش کر کے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرونگا کہ جمہوری عمل سے ہمیں کیا توقعات رکھنی چاہئیں؟

سرمایہ داری جمہوریت اور انقلاب

سرمایہ داری وہ طرز اور نظام زندگی ہے جو آزادی، مساوات اور ترقی کے حصول کو انسانیت کا نوعی حق (Human Right) سمجھتا ہے اور انفرادیت، معاشرت اور ریاست کی ترتیب اور تعمیر ان مقاصد اعلیٰ کے حصول کا ذریعہ گردانتا ہے، جمہوریت وہ نظمِ ریاست ہے جس میں اجتماعی فیصلے فرد کی آزادی، مساوات اور ترقی کے حصول کی خواہش کے اظہار کے طور پر اپنا جواز پیش کرتے ہیں، اسی لئے ہر سرمایہ دارانہ ریاست خواہ لبرل ہو یا قوم پرست، اشترا کی ہو یا سوشل ڈیموکریٹ، ایک ریپبلک پبلک کی حکومت ہوتی ہے، لبرل جمہوریتیں اور (People Democracy) دونوں عوام کی حاکمیت کی دعویدار ہیں اور دونوں ہی ریاستی مقتدرہ (State Elite) اپنے تفوق (Hegemany) کا جواز عوام کی نمائندگی کی بنیاد پر پیش کرتی ہیں، سرمایہ دارنہ طرز اور نظام زندگی میں ریاستی تحکیم کا یہ جواز ناگزیر ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام اور طرز زندگی اصولاً دہریت کا غماز ہے، اس طرز اور نظام زندگی میں انسانیت خدا کی موت کا اعلان اور اپنی خود مختاریت اور خود تخلیقیت کا اعلان کرتی ہے، سرمایہ دارانہ طرز اور نظامِ زندگی کا کلمہ خبیثہ لا الٰـــہ الاالانســـان ہے، عوام کی حکومت (Republic) لبرل بھی ہوسکتی ہے، اشترا کی بھی، قوم پرست اور سوشل ڈیموکریٹ بھی، تاریخی طور پر انقلاب سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعہ رائج شدہ طرز اور نظم ریاست کو تسخیر کر کے ایک دوسرے طرز اور نظم ریاست کو قائم کیا جاتا ہے، سرمایہ دارانہ تاریخ کے تناظر میں انقلابات بیرونی بھی ہوسکتے ہیں اور اندرونی بھی ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں صدی تک یورپ امریکہ اور ایشیاء میں مذہبی ریاستوں

(جو Republic نہ تھیں) کو مسخر کر کے سرمایہ دارانہ طرز اور نظم ریاست قائم کیا گیا یہ بیرونی انقلاب تھا، ۱۹ویں صدی کے بعد سے ایک سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کو مسخر کر کے متبادل سرمایہ دارانہ ریپبلک کی تعمیر کی جاتی رہی ہے، کبھی لبرل ریپبلکس کی جگہ اشترا کی ریپبلکس نے لے لی کبھی اشترا کی ریپبلکس کو مسخر کر کے لبرل قوم پرست ریاستیں بنائی گئیں، یہ سرمایہ دارانہ اندرونی انقلابات ہیں۔

ٹرمپ کا متوقع انقلاب

۱۹۸۰ کے بعد سرمایہ دارانہ نظام معاشی طور پر پر گلوبل ہو گیا سود، سٹہ اور اشیاء کی مارکیٹ (Financial,Stock and Commodity market) گلوبل ہو گئے اور بہت بڑی حد تک ترسیل زر اور اشیاء پر ملکی پابندیاں اٹھائی گئیں، کسی نہ کسی حد تک سرمایہ دارانہ معاشرتی اور ریاستی مقتدرہ بھی گلوبل (multinational Cosmopolitan) ہو گئیں لیکن سرمایہ دارانہ ریاستی نظم قومی ہی رہا اور امریکی قومی ریاست نے گلوبل سرمایہ کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کی۔ عالمی دفاعی اخراجات کا تقریباً ۴۵ فی صد امریکہ ہی صرف کرتا ہے اور اس کی افواج ۱۸۳ ممالک میں اڈہ جمائے ہوئے قتل عام میں مصروف ہیں۔

گلوبل اور ملکی ریاستی تنظیم نے معاشرتی عدم توازن کو جنم دیا، گلوبل معاشی عمل سے مستفید سرمایہ دارانہ معاشرتی اور ریاستی مقتدرہ ہی ہوئی، ترقی یافتہ ممالک کے عوام بالخصوص امریکی اپنے آپ کو گلوبلائزیشن کا شکار (Victim) گردانے لگے کیونکہ امریکہ میں معاشی نامساویت (inequality) ہوشربا انداز سے مسلسل بڑھ رہی ہے اور ایک عام امریکی گلوبلائزیشن کو اپنے لئے مضر گردانے لگا ہے، ٹرمپ کو کامیاب بنا کر ایک عام امریکی جو اپنے آپ کو محروم سمجھ رہا ہے گلوبل اشرافیہ اس کے غیر ملکی حلیفوں اور اس اشرافیہ کے لائے ہوئے غیر ملکی مزدوروں اور محنت کاروں سے بدلہ لے رہا ہے، ایک عام امریکی اس بات سے نالاں ہے کہ امریکی ریاست عسکری اور معاشی وسائل عالمی سرمایہ کی بڑھوتری کے لئے صرف کئے جائیں، اس کی خواہش ہے کہ سرمایہ کاری کے عمل کو امریکی ریاست اس طرح منظّم کرے تو سرمایہ کے ارتکاز کے فوائد صرف امریکہ میں ظہور پذیر ہوں، امریکی ریاست عالمی سرمایہ دارانہ نظم اور طرز زندگی کی پشت پناہی ہی سے دست کش ہو جائے۔

جمہوری عمل نے اس عام محروم امریکی کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ ایک نسبتاً سوشل ڈیموکریٹک ریاستی طرز کو ایک قوم پرست (fascist) ریاست میں تبدیل کرنے کی راہ ہموار کر دے، ٹرمپ نے اس عام ''محروم'' امریکی کا گلوبلائزیشن مخالف ایجنڈہ اپنا لیا لیکن اس کا امکان کہ وہ امریکی ریاست کو از سر نو قوم پرستانہ بنیادوں پر منظّم کر سکیں گے فی الحال محدود نظر آتے ہیں ایک ساتھ تین بہت بڑی رکاوٹیں ہیں، ایک میڈیا جو تقریباً پورے کا پورا گلوبل مقتدرہ اور یہودیوں کی گرفت میں ہے، دوسرے امریکی سودی اور سٹہ کاری کی مارکیٹ (financial market) جن کا انحصار بہت بڑی حد تک بیرونی قرضوں اور ترسیلات سے ہے، تیسری امریکی فوج جو بیرونی محاذوں سے واپس اور اپنے بجٹ میں کٹوتی بہت مشکل سے قبول کریگی، ان میں سب سے اہم کمزوری یہ ہے کہ ٹرمپ نے موجودہ امریکی ریاستی ڈھانچہ کو تبدیل کرنے کے لئے کوئی ایسی تیاری نہیں کی جیسے ہٹلر نے نازی پارٹی کو منظّم کرنے کے لئے کی تھی ان کے پاس نہ

کوئی قوم پرست فوج موجود ہے، نہ حکومتی بیوروکریسی، نہ لوکل ایڈمنسٹریشن، ان کو اپنی قوم پرستانہ پالیسیوں کی تشکیل اور تنفیذ کے لئے اس ہی فوج اور نوکر شاہی پولیس اور ماہرین پر انحصار کرنا پڑے گا، جو پچھلے چالیس سال سے گلوب میں رہی ہیں اور جس کے ضوابط عمل اس مقتدرہ نے نہایت عرق ریزی اور تدبّر سے مرتّب کئے ہیں، ٹرمپ برسر اقتدار آ کر امریکی ریاستی ڈھانچہ کو کمزور ضرور کر دیں گے لیکن کیا وہ اس کی قوم پرستانہ ترتیب نو میں کامیاب ہونگے ؟ اس کے بارے میں تیقّن سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، اگر موجودہ ریاستی مقتدرہ نے ان کو اپنے کئے وعدوں سے انحراف پر مجبور کر دیا تو ان کے حمایتی خاموش نہ بیٹھیں گے اور جمہوری جدوجہد عوامی مزاحمتی اور عسکری جدوجہد میں تبدیل ہونے کے امکانات ہیں اگر انہوں نے قوم پرستانہ ایجنڈہ زور شور سے نافذ کیا تو ریاستی اور معاشی مقتدرہ کا ردعمل شدید ہوگا، ابھی سے مغربی ساحلی صوبوں میں وفاق سے علیحدگی اور کینیڈا سے ادغام کی تحریکیں ابھرنے لگی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ٹرمپ قتل کر دیئے جائیں اور ان کے نائب Mike Pence تو ایک عام معتدل روایتی republican سیاست دان ہی ہیں۔

اسلامی انقلابی جماعتیں اور جمہوری عمل کا استعمال

ٹرمپ کی فتح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جمہوری عمل کو استعمال کر کے ریاستی مقتدرہ کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے، لہٰذا اسلامی انقلابی جماعتوں کو انتخابات میں ضرور حصہ لینا چاہئے، جمہوری عمل کے حلال ہونے پر (فرض ہونے پر نہیں) عصری علماء کا اجماع ہے، دور حاضر میں جمہوری عمل عوام کو متحرک اور منظّم کرنے کا شرعاً جائز اور مفید ذریعہ ہے، لیکن ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ ہم سرمایہ دارانہ طرز اور نظم ریاست کے خلاف ایک بیرونی انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں، کسی اندرونی سرمایہ دارانہ انقلاب کو برپا کرنے کی کوشش نہیں کر رہے، ہم سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کا انہدام چاہتے ہیں، لبرل ریاستی نظام کو سوشل ڈیموکریٹ سے یا اشتراکی نظام کو قوم پرست نظام سے تبدیل نہیں کرنا چاہتے اس لئے ہمارا کام سرمایہ دارانہ اندرونی انقلاب برپا کرنے والوں سے زیادہ کٹھن ہے، سرمایہ دارانہ اندرونی انقلاب برپا کرنے والے عوام سے تبدیلی اقتدار اور تزکیہ نفس کا مطالبہ نہیں کرتے، ٹرمپ کے حامی اور مخالفین دونوں ہی سرمایہ دارانہ اقتدار، آزادی، مساوات اور ترقی کے پرستار ہیں، دونوں کے کردار یکساں ہیں ان میں فرق صرف مفادات کے تعین کا ہے، ٹرمپ نے نفسی تبدیلی لانے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی، انہوں نے عوام اور مقتدرہ کے مفادات کے تضادات اجاگر کر کے قوم پرستانہ انقلاب لانے کی کوشش کی لیکن اسلامی انقلابی جدوجہد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز اور نظام ریاست کی طرف مراجعت ہے، اگر ہمارا جمہوری انقلابی ایجنڈہ لبرل یا سوشل ڈیموکریٹ یا قوم پرستانہ ہو تو ہم کبھی عوام میں اسلامی تحرک اور اسلامی انقلابی تنظیم نہ پیدا کر سکیں گے، بلکہ ہماری انتخابی جدوجہد محض سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کی جدوجہد ہوگی اور اس جدوجہد میں ہم جتنا کامیاب ہوں گے اتنا زیادہ ہماری جماعتیں سیکولرز (Secular) ہوتی چلی جائیں گی، اگر ہمارا انتخابی ایجنڈہ سوشل ڈیموکریٹ یا قوم پرستانہ ہوا تو ہم عوامی اسلامی عصبیت کو ابھارنے کی تصویت کیسے رکھ سکیں گے۔

عوامی اسلامی عصبیت کو ابھارنے کے لئے اسلامی انقلابی جماعتوں، مصلحین کی جماعتوں، مدارس، خانقاہوں اور روایتی برادریوں کا اشتراک عمل لازم ہے، اسلامی انقلابی عمل کی کامیابی کا دارومدار سب سے زیادہ تطہیر نفس اور اصلاح معاشرہ کے کام کے فروغ پانے پر منحصر ہے، لیکن اسلامی انقلابی جماعتیں عوامی تطہیر نفس اور اصلاح نفس کا کام نہیں کرسکتیں، یہ ان کا کام ہی نہیں یہ تو علماء کرام، صوفیاء اور مصلحین کی جماعتوں کا دائرہ کار ہے ہمیں اس بات کا ادراک ہونا چاہئے کہ انقلابی اسلامی جدوجہد اقامت دین کا محض ایک شعبہ ہے، اس سے کہیں زیادہ اہم تزکیہ نفس اور اصلاح معاشرہ کا کام ہے کیونکہ اسلامی انفرادیت غیر اسلامی ریاست میں بھی پنپ سکتی ہے اس کے برعکس اسلامی انفرادیت کی عدم موجودگی میں اسلامی ریاست کا قیام ناممکن ہے۔

اس لئے اسلامی انتخابی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ تزکیہ نفس، تطہیر معاشرہ کے کام سے پیوست ہو، کسی اسلامی جماعت یا گروہ، تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی، مدارس کے وفاق کے لئے یہ ممکن نہ رہے کہ وہ اسلامی انتخابی ایجنڈہ کی پشت پناہی سے براءت اختیار کریں یہی اسلامی انقلابی جماعتوں کی اصل constituency ہے اور ہمیں ان کو قائل کرنا ہے کہ اے بھائی! اگر تم ساتھ نہ دو تو ہم سے اکیلے کیا ہوگا۔۔۔

ٹرمپ کی کامیابی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انتخابات کے انقلابی استعمال کے لئے عوام کو جذباتی بنیادوں پر متحرک کرنا ضروری ہے، عقلی دلائل اس ضمن میں بالکل ہی بے کار ہیں، ٹرمپ کامیاب اس لئے ہوئے کہ وہ ایک عام امریکی کے غصہ، غضب، حسد اور جذبہ انتقام کو مہمیز دے سکے، لہٰذا اسلامی انقلابی جماعتوں کو ۲۰۱۸ میں ضرور حصہ لینا چاہئے، انتخابی ایجنڈہ خالصتاً اسلامی ہو، عوام کے حقوق فراہم کرنے کے وعدوں کے ذریعہ ان کے حرص اور طمع کو مہمیز نہ دی جائے یہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوگا، کسی سیکولر جماعت سے کسی سطح پر کوئی understanding یا Adjustment نہ کیا جائے زیادہ سے زیادہ اسلامی جماعتوں کو متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم پر جمع کر کے ایک ہی ایجنڈے پر الیکشن لڑا جائے۔

ہمارا بنیادی نعرہ ''اسلام خطرہ میں ہے'' ہونا چاہئے اور ہماری مہمات خالصتاً جذباتی ہو مثلاً حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم، تحفظ شعائر اسلام، تحفظ مساجد و مدارس وغیرہ پر مرکوز ہونی چاہئے اسی طریقے سے ہم جذباتی بنیادوں میں غیر سیاسی اسلامی گروہوں کے لئے ناممکن بنادیں گے کہ وہ ہماری انتخابی جدوجہد سے لاتعلق رہیں، انتخابی مہمات میں اس بات کی خصوصی کوشش کی جائے کہ قیادت پیروں اور وسیع حلقہ رکھنے والے شیوخ علماء کی ہو، کم از کم پختونخواہ میں ایک متبادل سول انتظامیہ، اسلامی عدلیہ اور دفاعی ادارتی صف بندی کی جائے تاکہ کامیابی کے نتیجہ میں ریاستی اقتدار سیکولر ریاست کے منتظمین سے اسلامی انقلابی کارکنوں کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کا عمل شروع کردیں۔

مولانا محمد کامران ہوتی
دارالعلوم رحمانیہ مردان

اسلام اور جمہوریت
نظریاتی اور عملی پہلو

سیاسی نظاموں میں ایک نظام جمہوری نظام ہے، اِس نظام کے بارے میں ہمیشہ سے اصحابِ نظر وفکر کا اختلاف چلا آ رہا ہے، بہت سارے لوگوں کا خیال ہے، کہ جمہوریت سب سے اچھی طرزِ حکومت ہے، اِس لیے کہ اِس میں انفرادی آزادی اور شخصی مساوات کو اہمیت دی گئی ہے، لیکن اصحابِ علم کے ایک بڑے گروہ کا خیال یہ ہے، کہ جمہوریت صراحتاً کفر ہے، اور یہ اسلامی مزاج کے ساتھ مطابق نہیں، اس لیے کہ جس نظام میں عوام کی حاکمیت اور مطلق آزادی کے تصور کو فروغ دیا جارہا ہو، وہ نظام ہی غیر عقلی اور فساد کا باعث ہے۔
علما کے ہاں یہ قاعدہ مسلم ہے کہ،

أن الحكم على الشئ فرع عن تصور (۱)

کسی چیز پر اثبات اور نفی کا حکم لگانے سے پہلے اس سے پوری طرح واقف ہونا ضروری ہے۔
فقہاء کرام کے ہاں ایک دوسرا قاعدہ بھی مشہور ہے کہ،

الرضا بالشيء لا يتحقق قبل العلم (۲)

کسی چیز کے بارے میں رضامندی اس وقت تک معتبر ہی نہیں، جب تک اس چیز کے بارے میں پورا علم نہ ہو۔
اِن دونوں قاعدوں کی وجہ سے یہ بات ضروری ہے کہ کسی بھی چیز پر حکم لگانے سے پہلے اس چیز کی پوری تعریف ہو جائے، اِس لیے جمہوریت کی تعریف اور وضاحت ذکر کی جاتی ہے۔

جمہوریت کی تعریف

جمہوریت (Democracy) یونانی زبان کا لفظ ہے، جس کا معنی ہے، عوام اور طاقت، یعنی جمہوریت اُس نظام حکومت کو کہتے ہیں، جس میں اقتدار عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔
ارسطو نے جمہوریت اور آمریت میں یہ فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جمہوریت میں ارباب حل وعقد کے

انتخاب میں کثیر تعداد شریک ہوتی ہے، جن میں غریب بھی ہوتے ہیں، جبکہ آمریت میں صرف امراء اور گنے چنے لوگ ہی سیاہ اور سفید کے مالک ہوتے ہیں، ابراہم لنکن نے جمہوریت کی تعریف یوں کی ہے: ''عوام کی حکومت، عوام کے لیے، اور عوام کے فائدے کے لیے''

ان تمام تعریفات سے یہ بات واضح ہوتی ہے، کہ جمہوریت میں عوام کو مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے وہ جسے چاہے اور جیسے چاہے، اپنا سربراہ منتخب کر سکتے ہیں، گویا ملک کے اصل فرمان روا عوام الناس ہوتے ہیں، ان کی مرضی کے بغیر نہ کوئی حکومت بن سکتی ہے اور نہ کوئی قانون منظور ہو سکتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ جمہوریت میں نظریاتی طور پر عوام کو حکومت کرنے کا اختیار ہوتا ہے، لیکن عملی طور پر ایسا کرنا ممکن ہی نہیں، اِس لیے عوام انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں اور پھر اکثریت کو حکومت مل جاتی ہے اور اقلیت حکومت کے غلط فیصلوں پر تنقید کر کے اگلی باری کا انتظار کرتی ہے، اِس وضاحت کے بعد جمہوریت کے بارے میں دو متضاد رائے پائی جاتی ہیں اور بظاہر دونوں افراط اور تفریط کے شکار نظر آتے ہیں۔

پہلی رائے

جمہوریت کے بارے میں ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ جمہوریت کے خلاف بولنا دراصل اسلام کے خلاف بولنا ہے، اس فرقہ کے نزدیک جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے اور انہوں نے جمہوریت کو مثالی طرزِ حکومت کے طور پر پیش کیا، اِس فرقہ کے بعض مفکرین نے کچھ زیادہ فراخ دلی سے کام لیا ہیں، چنانچہ مشہور مصری عالم رشید رضا نے خلافت راشدہ کو جمہوریت ہی کی ایک شکل قرار دیا ہے، علامہ یوسف قرضاوی اِس فرقہ کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الواقع أن الذی یتأمل جوهر الدیمقراطیة یجد أنه من صمیم الاسلام(۳)

حقیقت یہ ہے، کہ جو بھی جمہوریت کا بنظرِ غائر مطالعہ کریگا، تو وہ اِس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہی اسلام کی روح ہے۔

اور پھر جمہوریت اور آمریت کی باہمی فرق کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسلام ایسے آدمی کی امامت کو ناپسند سمجھتا ہے، جس سے لوگ ناراض ہو، تو ایسے آدمی کی بادشاہت سے کیسے راضی ہوگا، جس کو عوام نے منتخب نہ کیا ہوں؟

علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنی مشہور کتاب الفاروق میں حضرت عمرؓ کی حکومت کو جمہوری حکومت ثابت کرنے کے لیے بڑی وضاحت کے ساتھ تفصیل لکھی ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

حضرت عمرؓ نے خلافت کے متعلق جو تقریر کی تھی، وہ درحقیقت حکومت جمہوری کی اصلی تصویر ہے اور حکومت جمہوری کی حقیقت آج بھی اس سے واضح تر و صحیح تر نہیں بیان کی جاسکتی۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

حکومتِ جمہوری کا ایک بہت بڑا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے حقوق اور اغراض کی حفاظت کا پورا اختیار اور موقع دیا جائے، حضرت عمرؓ کی حکومت میں ہر شخص کو نہایت آزادی کے ساتھ یہ موقع حاصل تھا، اور لوگ علانیہ اپنے حقوق کا اظہار کرتے تھے، اضلاع سے تقریباً ہر سال سفارتیں آتی تھیں جن کو وفد کہتے تھے، اِس سفارت کا صرف یہ مقصد ہوتا تھا کہ دربار خلافت کو ہر قسم کے حالات اور شکایات سے مطلع کیا جائے اور دادرسی چاہی جائے، حضرت عمرؓ نے خود بار بار مختلف موقعوں پر اِس حق کا اعلان کر دیا تھا، یہاں تک کے خاص اس کے لیے مجمع عام میں خطبہ پڑھا(۴)

دوسری رائے

پہلی رائے کے برعکس دوسرے فرقہ کی رائے یہ ہے کہ جمہوریت اور اسلام میں صراحتاً تضاد ہے اور جمہوریت اسلام کے ساتھ کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتا، مزے کی بات یہ ہے، کہ آج کی دنیا میں جمہوریت کے علمبردار غامدی صاحب کے مذہبی پیش رو علامہ حمید الدین فراہی جمہوریت کا انکار کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

فوضی عربوں کے نزدیک ایک ناپسندیدہ طریقۂ حکومت تھا اور اسے وہ احمقوں کی حکومت قرار دیتے تھے لیکن اس وقت مغرب میں بہت سے لوگ اس طرز حکومت کے داعی و مبلغ ہیں اور اس سے عوام کو گمراہ کرتے ہیں، مگر یہ طریقہ بھی پہلے طرزِ حکومت کی طرح فتنہ اور نظام انسانی کی شکست وریخت کا ایک ذریعہ ہے، اللہ تعالی نے فرمایا ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ(۵)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں صاحب امر ہوان کی بھی۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُم(۶)

اور ان کے معاملات باہم مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی جمہوریت اور اسلام کے باہمی تضاد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

تاریکی اور روشنی میں، رات اور دن میں، بدی اور نیکی میں جو فرق ہے وہی جمہوریت اور اسلام میں ہے، آپ فلسفہ کی رو سے بھی غور کر لیں، آپ جمہوریت کی تعریف کریں، عوام کی حکومت، عوام کے لیے، عوام کے ذریعہ سے، عوام کی بہبود کے لیے، یہی تعریف ہے آپ کسی جگہ پڑھ لیجیے! اسلام میں اللہ کی حاکمیت، اللہ کی حکومت، اللہ کے قانون کے ذریعہ سے، اللہ کے ماننے والوں کے لیے، موٹی سی یہ تعریف ہے، کہیں پڑھ لیں، اب ان دونوں میں ذرا جوڑ ملایئے! ہے کوئی جوڑ ملتا ہوا، کوئی تک ہے۔

علامہ اقبالؒ تو جمہوریت سے اتنے ناراض نظر آتے ہیں کہ وہ جمہوریت کو ملوکیت کی مسخ شدہ صورت قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں.....

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس وخود نگر

ایک جگہ جمہوریت کی طرزِ حکومت پر بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں.....

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

چونکہ جمہوریت میں مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے اور ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اِس لیے اقبال ایسی حکومت کو چنگیزی حکومت قرار دیتے ہیں.....

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

پہلے گروہ کے دلائل

جن لوگوں کے ہاں جمہوریت ایک بہترین طرزِ حکمرانی ہے اور سارے مسائل کا حل جمہوریت پر عمل کرنے میں ہے، ان کی پہلی دلیل یہ ہے، کہ اسلام نے آمریت اور ڈکٹیٹرشپ کی پھر زور مذمت کی ہے، عوام الناس پر ان کی مرضی کے خلاف مسلط ہونا اور طاقت کے بل بوتے ان کو قابو کرنے کے متعلق قرآن نے نمرود اور فرعون کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد ان کی مذمت فرمائی ہے، فرعون کا یہ نعرہ تھا:

يَا أَيُّهَا المَلَأُ مَا عَلِمتُ لَكُم مِن إِلَهٍ غَيرِي (۷)

میں تو اپنے سوا تمہارے کسی اور خدا سے واقف نہیں ہوں۔

اِس نعرہ سے فرعون کی آمریت کا اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ اپنے علاوہ کسی کو خاطر میں لانے والا نہیں تھا، قرآن نے ایسے آمر اور ڈکٹیٹر کو فساد کا اصل جڑ قرار دیا ہے، گویا آمریت میں ہر طرف فساد ہی فساد ہوگا، اِس لیے کہ ان کی سرکشی ہی فساد کا متقاضی ہوتی ہے، فرعون کے بارے میں ارشاد باری ہے:

وَفِرعَونَ ذِي الأَوتَادِ الَّذِينَ طَغَوا فِي البِلَادِ فَأَكثَرُوا فِيهَا الفَسَاد (۸)

اور میخوں والے فرعون کے ساتھ کیا کیا، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں سرکشی اختیار کر لی تھی اور ان میں بہت فساد مچایا تھا۔

طغیان اور سرکشی کی تشریح قرآن نے العلو کے ساتھ کی ہے، چنانچہ اللہ تعالی ارشاد ہے:

إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا مِنَ المُسرِفِينَ (۹)

حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا سرکش، حد سے گزرے ہوئے لوگوں میں سے تھا۔

ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ فِرعَونَ عَلَا فِی الأَرضِ وَجَعَلَ أَهلَهَا شِیَعًا یَستَضعِفُ طَائِفَةً مِنهُم یُذَبِّحُ أَبنَائَهُم وَیَستَحیِی نِسَائَهُم إِنَّهُ کَانَ مِنَ المُفسِدِینَ (۱۰)

واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی اور اس نے وہاں کے باشندوں کو الگ الگ گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا جن میں ایک گروہ کو اس نے اتنا دبا کر رکھا ہوا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا، جو فساد پھیلایا کرتے ہیں۔

اِن آیتوں سے معلوم ہوگیا، کہ سرکشی اور فساد آپس میں لازم ملزوم ہیں، دوسری دلیل ان لوگوں کی یہ ہے کہ قرآن نے صرف آمر کی مذمت نہیں فرمائی، بلکہ اس قوم کی بھی مذمت فرمائی، جو آمر کے متبع اور فرمان بردار ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَتِلكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآیَاتِ رَبِّهِم وَعَصَوا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیدٍ (۱۱)

یہ تھے عاد کے لوگ جنہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا، اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی، اور ہر ایسے شخص کا حکم مانا جو پرلے درجے کا جابر اور حق کا پکا دشمن تھا۔

ایک جگہ ارشاد باری ہے:

فَاتَّبَعُوا أَمرَ فِرعَونَ وَمَا أَمرُ فِرعَونَ بِرَشِیدٍ یَقدُمُ قَومَهُ یَومَ القِیامَةِ فَأَورَدَهُمُ النَّارَ وَبِئسَ الوِردُ المَورُودُ (۱۲)

انہوں نے فرعون ہی کی بات مانی، حالانکہ فرعون کی بات کوئی ٹھکانے کی بات نہیں تھی۔ وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا، اور وہ ان سب کو دوزخ میں لا اتارے گا، اور وہ بدترین گھاٹ ہے جس پر کوئی اترے۔

اِن آیتوں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ صرف آمر نہیں، بلکہ متبعین بھی قابلِ مذمت ہیں، اِس لیے کہ ان کٹ پتلیوں کی وجہ سے آمر کو حوصلہ ملا، اِن لوگوں کی ایک دلیل یہ بھی ہے، کہ طبقاتی حقوق کے دور میں انسانوں کو پیدائش کے لحاظ سے مساوی حیثیت حاصل نہیں تھی بلکہ عزت واحترام اور حقوق کے لحاظ سے انھیں اشراف کے خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور یہ انسانیت کی تذلیل کے مترادف تھا، اس لیے جمہوریت میں اس بات پر کافی زور دیا گیا ہے کہ سماج کے تمام افراد باعتبارِ پیدائش مساوی ہیں، نسل ورنگ، ذات پات اور جائے پیدائش کے لحاظ سے ان کے درمیان کسی قسم کا امتیازی سلوک جمہوریت کی روح کے منافی ہے، مساوات کا یہ مطلب بھی ہے کہ سماج کا ہر فرد قانون کی نظر میں یکساں ہے، ان میں کسی طرح کی تفریق ممنوع ہے۔ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جمہوریت میں ہر قسم کی آزادی میسر آجاتی ہے، دوسری آزادیوں کے علاوہ جن میں عقیدہ و ضمیر کی آزادی بھی شامل ہے، اظہارِ رائے کی آزادی جمہوریت کی ایک بڑی خوبی ہے، ایک جمہوری معاشرے میں ہر شخص کو غور وفکر اور بحث ومباحثہ کی آزادی حاصل ہوتی ہے، وہ جس خیال کو صحیح سمجھتا ہے اس کو کسی خوف اور اندیشے کے بغیر ظاہر کرسکتا ہے اس میں مخالف رائے کو بھی اہمیت دی جاتی ہے، اس طرزِ عمل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ صحیح نقطہ نظر کو غالب آنے کا موقع ملتا ہے۔

دوسرے گروہ کے دلائل

جن لوگوں کے ہاں جمہوریت اسلام کے ساتھ بالکل متصادم ہے، ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حاکمیتِ اعلیٰ ہونے کا حق اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، لیکن جمہوریت میں یہ حق عوام کے سپرد کیا جاتا ہے، آئین اور قوانین وہ منظور ہوتے ہیں، جن کو عوامی نمائندے قبول کرلے، اگرچہ وہ قرآن اور حدیث کے صریح منافی ہوں، مذہب کی رو سے خدا ہی حاکم اعلی ہے اور بندوں کو اسی کے قانون کی اطاعت کرنی ہے، جبکہ جمہوریت میں معاملہ اس کے برعکس ہے، اس میں خدا کے بجائے عوام ہی حاکم اور قانون ساز ہوتے ہیں اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت میں مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے، ریاست کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

علامہ اقبالؒ نے جمہوریت کے ناپسندیدگی کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس میں معیار کی بجائے مقدار پر توجہ دی جاتی ہے، حالانکہ اسلام نے تعلیم، قابلیت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے لوگوں میں تمیز کیا ہے، اقبال جمہوریت کو احمقوں کی حکومت سمجھتے تھے کیونکہ اس میں ایک جاہل اور عالم دونوں انتخابِ حکومت میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں، اقبال اپنے دعوے کو مزید مضبوط کرنے کے لیے کہتے ہیں.....

گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

حقیقت حال

اِس تمام تر تفصیل کے بعد یہ اندازہ لگانا ضروری ہے، کہ جمہوریت کی موجودہ صورت سے کون سے گروہ کی تائید ہوتی ہے، جن لوگوں کے ہاں جمہوریت ایک بہترین طرزِ حکمرانی ہے، ان کی پہلی دلیل یہ ہے، کہ اسلام نے آمریت کی مذمت کی ہے، اِس لیے کہ آمریت میں ایک آدمی ظلم اور جبر سے عوام پر مسلط ہوتا ہے، جبکہ جمہوریت میں طاقت عوام کے پاس ہوتی ہے، لیکن موجودہ جمہوریت کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک خام خیالی ہے، اِس لیے کہ اس جمہوریت میں بھی طاقت چند لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جن کو ماحول خوشنما بنانے کے لیے عوامی نمائندوں کے نام سے پکارا جاتا ہے، دوسری طرف اِن کی یہ دلیل یقیناً آمریت کی مذمت پر دال ہے، لیکن اِس سے موجودہ جمہوریت کی حسن کہاں سے ثابت ہوتی ہے، موجودہ جمہوری حکومتوں کے سب سے بڑی خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

> درحقیقت جمہوری نظامِ حکومت کے پیچھے ایک مستقل فلسفہ ہے، جو دین کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا اور جس کے لیے سیکولرزم پر ایمان لانا تقریباً لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے (۱۳)

مفتی صاحب کے اِس دعوے کی وضاحت یہ ہے کہ موجودہ جمہوریت میں عوام کو حاکم اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے اور عوام کا ہر فیصلہ جو کثرتِ رائے کی بنیاد پر ہوا ہو، وہ واجب التعمیل اور ناقابلِ تنسیخ سمجھا جاتا ہے، اگرچہ وہ فیصلہ اسلام کے ساتھ صراحتاً متصادم ہو اور یہی سیکولرازم ہے کہ جب مذہب کو فرد کا ذاتی معاملہ قرار دیا جائے اور ریاست سے اس کو الگ تصور کیا جائے۔

جمہوریت کے لیے سیکولرزم کے جزء لاینفک ہونے کی ایک دلیل موجودہ عالمی قوتوں کا کردار بھی ہے، چنانچہ دنیا کے جس ملک میں مذہبی طبقہ جمہوریت کو اپنے پورے شرائط کے ساتھ (سوائے سیکولرزم کے) اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیتا ہے، وہاں کی ''خالص جمہوری حکومت'' بھی اِن عالمی قوتوں کی نظروں کا کانٹا بن جاتی ہے اور اِس کی تازہ مثال ترکی کے موجودہ حالات ہیں، اگر اِس سیکولر جمہوری نظام میں تمام مذاہب سے بیزاری کا اعلان ہوتا، تو چار و ناچار مسلمان بھی اس کو قبول کرنے کے لیے مجبور ہوتے، لیکن غضب اور منافقت کی بات یہ ہے کہ یہاں مذہب سے بیزاری کا مقصد دراصل صرف اسلام سے برأت کا اعلان ہے، یہی وجہ ہے کہ کمال اتاترک نے جس جمہوریت کی بنیاد رکھی تھی، اس کے بارے میں بی بی سی کا یہ تجزیہ ملاحظہ کیجئے:

> ۱۹۲۳ میں اتاترک نے جس ترک جمہوریہ کی بنیاد رکھی اس کا قبلہ مغرب تھا مگر ۸۰ برس بعد جب ۲۰۰۳ میں اردوغان اقتدار میں آئے تو انہوں نے سرکاری دفاتر میں عورتوں کے سر ڈھانپنے پر عائد پابندی ختم کردی، کئی اعتدال پسندوں نے بھی اس کی حمایت کی (۱۴)

اِس خبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اتاترک نے ''عورتوں کے سر ڈھانپنے پر'' پابندی عائد کی تھی، جبکہ اردوغان نے وہی پابندی ختم کردی، اگر اتاترک واقعی سیکولر تھے، تو اس نے مذہب کو سرکاری معاملہ قرار دے کر سر ڈھانپنے پر پابندی کیوں لگائی! پابندی تو پابندی ہوتی ہے، چاہے وہ سر ڈھانپنے پر ہو، یا سر کھولنے پر، البتہ اردوغان نے یہی پابندی ختم کردی۔

اِس بارے میں جمہوریت کے سب سے بڑے علم بردار امریکہ کے نئے جمہوری صدر کی تقریب حلف برداری میں دیا گیا بیان بھی قابلِ ذکر ہے، وہ کہتے ہے: دنیا سے اسلامی دہشتگردی ختم کریں گے (۱۵) موجودہ جمہوری نظام کی جانب داری کا اندازہ اِس بیان سے بخوبی ہوسکتا ہے اِس لیے کہ کسی مذہب میں دہشت گردی کا ہونا کم از کم میرے علم میں نہیں ہے، لیکن اگر صدر بہادر کو کسی مذہب میں نظر آرہی ہے، تو پھر اسی تناظر میں امریکی (عیسائی)، اسرائیلی (یہودی) اور نیٹو (جمہوری) دہشتگردی کو ختم کرنے کا بیڑا بھی خود جنابِ صدر کو اٹھانا چاہیے، کثرتِ رائے کے اِس جمہوری فلسفے کو قرآن نے رد کیا ہے، ارشاد باری ہے:

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (۱۶)

اور اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کے پیچھے چلو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کرڈالیں گے۔

اِس قسم کی کثرتِ رائے کے متعلق مفتی تقی عثمانی نے حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ کی یہ عبارت نقل کی ہیں:

> آجکل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے، صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر یہ بھی معلوم ہے، کہ رائے سے کس قسم کی رائے مراد ہے؟ کیا عوام کالانعام کی؟ اگر انہیں کی رائے مراد ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا، ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہودؑ ایک طرف، آخر کیوں انہوں نے توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی؟ کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا؟ اسی لیے کہ وہ قوم بہت جاہل تھی اِسکی رائے جاہلانہ رائے تھی (۱۷)

موجودہ جمہوریت سے صرف مسلمان مفکرین ہی شاکی نہیں ہے، بلکہ اِس نظام کے سب سے بڑے علم بردار بھی شکوہ کرتے نظر آتے ہیں، چنانچہ برطانوی فلسفی جان اسٹوارٹ مل کہتا ہے:

جمہوریت بلاشبہ ضروری اور لازمی چیز ہے لیکن یہ اپنے اندر کچھ برائیاں بھی رکھتی ہے۔اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں اکثریت بالعموم معمولی صلاحیت کے حامل افراد کو حکمرانی کے لیے منتخب کرتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آزادی، اصلیت (Originality) اور لامرکزیت (Decentralization) کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔

گویا جمہوریت کے عملی نقائص میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں سارے لوگ خواہ خواندہ ہوں یا ناخواندہ، انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں اور اس کے نتیجے میں نااہل افراد بھی محض عیاری یا سرمائے کی طاقت پر منتخب ہوجاتے ہیں۔

اِس پوری تفصیل کے بعد یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جمہوریت اپنے اصلی جوہر کے اعتبار سے اسلام کے منافی نہیں ہے، اِس لیے کہ جمہوریت میں لوگ اپنے لیے حاکم کو منتخب کرتے ہیں، تاکہ اُن پر وہ آدمی حکومت کرسکے، جس کو تمام لوگ پسند کرتے ہوں، غلطی کے وقت اپنے حاکم کا محاسبہ کرسکتے ہوں اور حقوق کی ادائیگی سے انحراف کی صورت میں انہیں معزول کرسکتے ہوں اور اِس طرح کرنے میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن موجودہ جمہوریت میں بے شمار قباحتیں مغرب کے بنائے ہوئے اپنی قوانین کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، جن میں بعض کا تذکرہ اِس مضمون میں کیا گیا، لہٰذا کوئی ممنوع نہیں ہے، کہ مسلمان مفکرین اور قائدین جمہوریت کے علاوہ ایسی طرزِ حکومت کے بارے میں غور وفکر کرتے رہے، جو جمہوریت کے مقابلہ میں اسلام کے ساتھ زیادہ موافقت رکھتی ہو، اور آج کے زمانے میں قابلِ عمل بھی ہو، لیکن جب تک ایسی کوئی صورت میسر نہیں آتی جمہوریت میں رہ کر اپنے اہداف حاصل کرنے چاہیے، اور چونکہ مسلمانوں کو اِس میں تغیر اور تبدل کا پورا پورا حق حاصل ہے، اِس لیے ساتھ ساتھ جمہوریت کے اس فلسفہ کو بھی درست کرنے کی کوشش کرے، جس سے حلال کو حرام کرنا، یا حرام کو حلال کرنا لازم آتا ہو۔

مصادر ومراجع

(۱) ڈاکٹر محمد مصطفی الزحیلی، الوجیز فی اصول الفقه الاسلامی، دار الخیر، دمشق، ج۱ ص ۳٦۱ (۲) شمس الائمه السرخسی، المبسوط، دار المعرفه، بیروت، ج۵ ص ۲۱ (۳) یوسف قرضاوی، من فقه الدولة فی الاسلام، دار الشروق، قاهره، ص ۱۳٤ (۴) شبلی نعمانی، الفاروق، دارالاشاعت، کراچی، ص ۱۸۳ (۵) النساء: ۵۹ (٦) الشوری: ۳۸ (۷) القصص: ۳۸ (۸) الفجر: ۱۱-۹ (۹) الدخان: ۳۱ (۱۰) القصص: ٤ (۱۱) هود: ۵۹ (۱۲) هود: ۹۸ -۹۷ (۱۳) تقی عثمانی، حکیم الامت کے سیاسی افکار، ص ۱۷ (۱۴) بی بی سی، ۱۹ جنوری، ۲۰۱۷ (۱۵) روزنامہ ایکسپریس، ۲۱ جنوری، ۲۰۱۷ (۱٦) الانعام: ۱۱٦ (۱۷) حکیم الامت کے سیاسی افکار، ص ۱۹

ڈاکٹر سیّد خالد جامعی
محقق ومفکر جامعہ کراچی

علماء کا مکان (جگہ Space) بدلنے سے
مقام (معاشی مرتبہ Status) کیوں بدل جاتا ہے؟

ہمارے علماء کرام کی تنخواہیں دنیا میں سب سے کم کیوں ہیں؟ علماء کے معاوضے پاکستان میں سب سے کم کیوں ہیں؟ یہ ہماری عظیم اسلامی ریاست کا مسئلہ کیوں نہیں ہے؟ شیخ الحدیث کی تنخواہ پندرہ ہزار روپے ہے مگر یہی محترم مکرم شیخ الحدیث اسی علم اور اسی جسم کے ساتھ کسی یونیورسٹی کی ملازمت قبول کرلیں تو تنخواہ ڈیڑھ لاکھ روپے ہوجاتی ہے، آخر کیوں؟ سرکاری ادارے کے ایک جاہل چپراسی کی تنخواہ، مراعات، سہولتیں، فوائد بڑے بڑے علماء (جو کئی زبانوں کے ماہر اور علم وتقویٰ کا بے مثال نمونہ ہیں) سے کئی گنا زیادہ کیوں ہیں، آخر ان میں کیا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے؟ ان سب سوالات کے جوابات کا جائزہ ذیل مضمون میں تفصیل سے لیا گیا ہے، یہ مضمون الصدیق کی سائز کے تناسب سے ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں جامعی صاحب نے علم وعلماء دوستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت اہم نکات کی طرف نشاندہی کی ہے، الصدیق کی محدود صفحات اس اہم مضمون کو مکمل شائع کرنے کے متحمل نہیں اس پر ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں، مضمون کا خلاصہ نذر قارئین ہیں۔

آپ نے کبھی اس سوال پر غور کیا کہ پاکستان میں بڑے بڑے مکرم محترم معظم علماء کے معاوضے، مشاہرے اور تنخواہیں سب سے کم کیوں ہیں؟ اتنے کم کہ اگر آپ سنیں تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں؟ اتنے کم معاوضوں کے باوجود یہ مدارس مساجد اور یہ محترم مکرم معظم علمائے کرام بغیر کسی شکایت، اعتراض، احتجاج کے دین کی خدمت پورے ذوق وشوق، اہتمام وانصرام کے ساتھ انجام دے رہے ہیں، صبر وشکر کی اسلامی اصطلاحات کا عملی نمونہ اس عہد میں یہی علماء کرام ہیں چند سال پہلے کی بات ہے ہم نے ذاتی طور پر معلوم کیا تو یہ بات ہمارے علم میں آئی کہ ایک بہت بڑے مدرسے کے محترم شیخ الحدیث کی تنخواہ صرف پندرہ ہزار روپے ماہانہ تھی، حالانکہ وہ محترم عالم عربی، فارسی، اردو، پنجابی، پشتو اور ترکی زبان بھی جانتے تھے، وہ انگریزی سے بھی بہت اچھی طرح واقف تھے، سرکاری اداروں کے ایک جاہل، غبی، کند ناتراش چپراسی کی تنخواہ اور مراعات ان محترم شیخ الحدیث سے کئی گنا زیادہ ہیں اس کے ساتھ بے شمار مراعات، سہولیات، الگ ہیں مثلاً علاج معالجہ کی مفت سہولت، رہائش گاہ، مختلف الاؤنسز، ریٹائرمنٹ کے بعد پینشن بچوں کی نوکری کی ضمانت وغیرہ وغیرہ۔

اللہ والے، صابر وشاکر کون لوگ ہیں؟

ایک اسلامی مملکت میں جسے دعویٰ ہے کہ وہ ریاست مدینہ کے بعد دنیا کی پہلی نظریاتی اسلامی مملکت ہے اس عظیم اسلامی مملکت میں ایک عالم کی یہ توقیر، اور ایک جاہل کی یہ عزت، اکیسویں صدی میں پندرہ بیس ہزار روپے میں گزارہ کرنے والے اتنے بڑے عالم سے بڑا درویش صوفی اہل اللہ کون ہوسکتا ہے؟ جو مدرسے اور مسجد کو خیر باد کہہ کر کسی سرکاری، غیر سرکاری، کثیر القومی ادارے میں ملازمت کرے تو اسے نہایت آرام سے ڈیڑھ لاکھ روپے ماہانہ، شاندار رہائش گاہ، ایر کنڈیشنڈ کمرہ، دیگر بے شمار سہولیات نہایت آرام سے مل سکتی ہیں، لیکن کوئی شیخ الحدیث اپنے مدرسے، مسجد کو چھوڑ کر کسی سرکاری ادارے کسی کارپوریشن، کسی ملٹی نیشنل میں فرائض انجام دینے پر آمادہ نہیں ہوتے، اس توکل، بے نیازی اور دنیا سے بے پروائی کا راز ان کے اس ایمان ویقین میں پوشیدہ ہے، جو اسلامی علمیت نے عطا کیا ہے، لیکن بنیادی سوال یہی ہے کہ علماء کے معاوضے کیوں اتنے کم ہیں؟ علماء اتنے کم معاوضوں کے باوجود شب وروز دین کی خدمت میں مصروف ہیں وہ کبھی ان قلیل معاوضوں پر کوئی احتجاج، حرف شکایت تک زبان پر نہیں لاتے آخر کیوں؟

علماء اپنے خود اختیاری فقر پر فخر کرتے ہیں

توکل، صبر شکر کی اصطلاحات کا عملی نمونہ کیا عہد حاضر میں ان قلیل المشاہرہ علماء کے سوا کوئی اور ہوسکتا ہے؟ لوگ درویش، صوفی اور اہل اللہ کا پوچھتے ہیں کہ عصر حاضر میں اللہ والے نہیں ملتے، وہ جا کر ان علماء کو دیکھ لیں منہج اہل سنت کے اکثر علماء آپ کو اسی حال میں ملیں گے، خوارج، معتزلہ، شیعہ مکاتب فکر کے اکثر علماء کے اکثر احوال سے ہم واقف نہیں لیکن ماضی میں ان مکاتب فکر کے علماء بھی عبادات وریاضت میں بے مثال تھے، خوارج جیسا فرقہ جس نے جناب سیدنا حضرت علی مرتضیٰؓ اور سیدنا حضرت امیر معاویہؓ کی تکفیر کی، ان کے قتال کا حکم دیا اور اپنے سوا پوری امت کو کافر قرار دیا، ان کے آئمہ بھی سادگی، درویشی اور فقر واستغناء کا بے مثال نمونہ تھے، عہد ماضی کے خوارج، معتزلہ کے علماء عہد حاضر کے جدید خارجیوں اور معتزلیوں سے بالکل مختلف تھے، ان کے اختلافات اور انحرافات ان کے اخلاص اور اندرونی تقاضوں سے ابھرے تھے، ان کے تفردات ان کے داخلی بحران کا نتیجہ تھے، وہ کسی بیرونی طاقت، کسی کافر سلطنت کی تقلید کے لئے اجتہاد نہیں کررہے تھے، عہد حاضر کے خوارج اور معتزلی عالمی استعمار کے نمائندے ہیں، ماضی کے خوارج اور معتزلہ کا کلمہ حق تھا مقصد باطل، عہد حاضر کے خوارج ومعتزلہ کا کلمہ بھی باطل ہے اور مقصد بھی باطل۔

یہ استغناء، بے نیازی، فقر اپنے خود اختیاری فقر پر فخر، اس مسند کی برکت ورحمت کا صلہ ہے، جس پر یہ رونق افروز ہیں، یہی علماء ہیں جو شب وروز دین کی نشر واشاعت میں مصروف ہیں، یہ اللہ کے کام میں ایسے مشغول ہیں کہ معاش کمانے کیلئے فرصت نہیں یہ خود دار ہیں سوالی نہیں انہی کے بارے میں قرآن نے صبح محشر تک امت کو حکم دیا ہے کہ ان کو تلاش کرو اور ان کی آبرومندانہ، استعانت کرو، یہ فریضہ ہے اور اس کا حکم امت کے ہر فرد کو اللہ نے اللہ والوں کیلئے دیا ہے لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ (البقرة ۲۷۳) قرآن کریم نے علماء کی خدمت کرنے والوں، اللہ کی راہ میں انفاق کرنے والوں کو انفاق کے بعد نہایت سختی سے احسان جتانے کی ممانعت کی ہے، اس سے بہتر ہے کہ یہ احسان ہی نہ کیا جائے اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًی لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ0 قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًی وَ اللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ (البقرة۲۶۲،۲۶۳) احسان جتانے سے یہ نیکی، نیکی نہیں رہتی، گناہ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰی كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ(البقرة۲۶۴)

علماء کی ضروریات کا خیال رکھنا ضروریات دین میں شامل ہے

یہی وہ عزت مند، خوددار علماء اور ان علماء کے مقلدین ہیں جو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے، نہ سوال کرتے ہیں، نہ کسی سے چمٹ کر کچھ طلب کرتے ہیں، قرآن نے ان سب کو قانع کہہ کر پکارا ہے وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِیْهَا خَیْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ(الحج:۳۶) قرآن نے علماء کو اقربین، ابن السبیل، مسکین، چمٹ کر مانگنے والوں، سائلین اور معتر کے زمرے میں شامل نہیں کیا، یہ وہ علماء ہیں جن کو سوال کرنے یا ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہیں، یہ اصحاب صفہ کے وارث اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند کے جانشین ہیں، یہ وہ عظیم لوگ ہیں جنہیں اپنے فقر پر فخر ہے اس خود اختیاری فقر کے راستے پر وہ خوش ہیں، شاکی نہیں، ان علماء سے محبت ان کی تقلید، ان کی خدمت دین کا تقاضہ ہے ان کی ضروریات کا خیال رکھنا بھی ضروریات دین میں شامل ہے، انہیں دنیا کی مصروفیات مشاغل سے فارغ کر کے فارغ البال، مرفع الحال اور خوش حال رکھنا اس امت کی ذمہ داری ہے اور ہر اسلامی حکومت کی اساسی ذمہ داری ہے، کیا ہماری ریاست یہ کام کر رہی ہے؟

دینی علوم کے علماء کو دنیا کی ہر جدید ریاست جاہل سمجھتی ہے

عرب ممالک میں علماء کے معاوضے اصولی طور پر نہیں، روایتی طور پر بہت زیادہ ہیں کیونکہ عرب معاشروں میں مذہبی روایت تمام تر جدیدیت، سیکولرازم، لبرل ازم کے باوجود ایک قوت ہے، علماء کا خاص اثر ہے اور علماء کی عزت کرنے پر ریاست فی الحال خود کو مجبور پاتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ برف پگھل رہی ہے، لوگ لبرل ہو رہے ہیں، علماء کی گرفت کم زور ہو رہی ہے، مگر پاکستان اور ہندوستان اور دنیا کے دیگر ممالک میں علماء کے معاوضوں کی صورت حال ٹھیک نہیں ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دین کو کوئی بھی ریاست علم

نہیں سمجھتی لہٰذا اس علم کے حامل کو عالم نہیں سمجھتی جاہل سمجھتی ہے، مغرب کے اکثر ممالک میں جدیدیت کے فلسفے کے بعد مذہب ریاست سے ہی نہیں لوگوں کی ذاتی زندگی سے بھی بے دخل ہو گیا، اکثر لوگ لبرل ہو گئے لہٰذا کلیسا بند ہونے لگے کیونکہ کلیسا کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا، پہلے ریاست، کلیسا کی سرپرستی کرتی تھی، عوام دین سے محبت رکھتے تھے لہٰذا ۱۷۹۶ء تک یورپ کی تین چوتھائی زمین کلیسا کی ملکیت تھی جو خدمت خلق کے کاموں میں استعمال ہوتی تھی، لوگ مرنے سے پہلے جائداد کلیسا کے سپرد کر دیتے تھے آج یورپ میں ہر مہینے کلیسا فروخت ہوتے ہیں الحمدللہ عالم اسلام میں یہ صورت حال ابھی پیدا نہیں ہوئی لیکن ٹیکنو سائنس، ترقی، آزادی، مساوات کے عقیدوں کی مزاحمت نہیں کی گئی تو یہی صورت حال یہاں رونما ہو کر رہے گی کیونکہ جدید ریاست صرف دنیاوی علم کی اور علوم عقلیہ کے عالم کی سرپرستی کرتی ہے

کسی علم کو عزت تب ملتی ہے جب وہ سائنس کے ساتھ جڑ جائے

عہد حاضر میں اگر کوئی علم سائنس سے کمتر ہے تب بھی وہ اپنے ساتھ سائنس کا سابقہ لاحقہ لگا کر ہی عزت حاصل کر سکتا ہے لہٰذا Humanties کے مضامین کو اب سوشل سائنس، علم کتاب خانہ کو لائبریری سائنس انسانی مزاج رویوں کو Behavierial science کہہ کر ان علوم کا درجہ بلند کر دیا جاتا ہے، چونکہ مذہبی علوم جنہیں بعض جدیدیت پسند دانشور Islamic sciences کہتے ہیں ان کو کوئی سائنس نہیں مانتا لہٰذا ریاست ان علوم سے لاتعلقی کا اظہار کرتی ہے، مسلمان اپنے روایتی علوم اور قرآن وسنت کی سند آج کل سائنس سے ثابت کرتے ہیں یعنی کسی علم کو عزت اس وقت ملتی ہے جب وہ سائنسی ہو جائے یا جدید سائنس کے معیار کے مطابق ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ عالم اسلام کے لئے پیمانہ سائنس ہے جس پر مذہب کو پرکھا جا رہا ہے یا ثابت کیا جا رہا ہے، یہ ہمارا مسئلہ ہے مغرب کا مسئلہ نہیں ہے مغرب میں سائنس کی سند کے لئے قرآن کی ضرورت نہیں سائنس خود سند ہے حجت ہے قطعی ہے Take forgranted اور End in itself ہے افسوس ہے کہ مسلمان اپنے دین کی قطعیت پر اس یقین سے محروم ہو رہے ہیں جو کفار کو اپنے کفر پر حاصل ہے

پاکستانی ریاست اور علماء کے تعلق کی نوعیت

روایتی معاشروں میں کسی فرد، کے لیے سب سے بڑی سزا یہ ہوتی تھی کہ خاندان، قبیلہ، برادری اس فرد کی حرکات وسکنات سے تنگ آ کر اس سے لاتعلقی کا اعلان کر کے اس کا سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کر دیتی تھی اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اب اس زمین پر اس کا انسانوں سے تعلق ختم ہو گیا ہے اب وہ ایک تنہا وجود ہے جو اپنا بوجھ خود اٹھانے کے لیے باقی رہ گیا ہے، پاکستانی ریاست نے بھی علماء مدارس اور دینی اداروں کے ساتھ کچھ ایسا ہی رویہ روا رکھا ہے علماء کا معاشی سماجی مقاطعہ غیر اعلانیہ جاری وساری ہے مگر یہ صرف پاکستان کا پاکستانی حکمرانوں کا ظلم نہیں جدید ریاستی ڈھانچے کی ہیئت ترکیبی ہی یہی ہے یہ Structural Problem ہے۔

جدید ریاست مذہبی علوم کی سرپرستی نہیں کرتی

ہر جدید ریاست سائنس اور سوشل سائنس کے علوم کے لیے اربوں روپے خرچ کرتی ہے، مگر مذہبی علوم کے لیے ایک روپیہ

خرچ نہیں کرتی، کیونکہ وہ اس کو علم ہی نہیں سمجھتی لہٰذا ریاست جہالت کی سرپرستی کیسے کرسکتی ہے؟ جدید فلسفے اور جدیدیت (Modrenism) میں نفس انسانی (Self) ایک آزاد، خودمختار، فاعل مختار، مطلق وجود ہے اس نفس کو کسی خارجی ذریعے سے ہدایت رہنمائی کی روشنی لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لہٰذا اس نفس کی تعمیر، تشکیل، تہذیب، تزکیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ نفس مطلقاً آزاد ہے اور عقلیت کے ذریعے یہ خود ہی اپنا راستہ تلاش کرلیتا ہے یہ عادلانہ ذات ہے جو سیکولر اسکول اور میڈیا کے ذریعے خود بخود تعمیر، تشکیل اور تربیت کے مرحلوں سے گزرتی ہے اسے تہذیب اخلاق اور اقدار سکھانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں لہٰذا تمام جدید ریاستوں میں تزکیہ وتصفیہ نفس اور تعمیر وتشکیل ذات کا کوئی نظام، کوئی ادارہ، کوئی طریقہ نہیں ہے لہٰذا علماء دینی تعلیم دینی مدرسوں کی کیا ضرورت ہے؟ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر دینی تعلیم کا ایک پرچہ ہوتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ جب یونیورسٹی اور کالجز میں امتحانات ہوتے ہیں تو بیت الخلاء کے اندر اور باہر اسلامیات کی کتابوں کے ڈھیر اور پھٹے ہوئے صفحے پڑے ہوئے ہوتے ہیں، جب بھی کسی مضمون کو غیر موثر کرنا ہو جس سے کوئی مادی معاشی مالی فائدہ بھی حاصل نہ ہوسکتا ہو اسے نصاب کا حصہ بنا دیجیے اور اس کا حشر دیکھ لیجیے اردو اور مطالعہ پاکستان کے مضامین کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔

دینی مدارس عوام کی دین سے محبت کے باعث چل رہے ہیں

پاکستان کے سیکولر اداروں کے اسلام پسند اساتذہ کا ایک خفیہ سروے کیا گیا کہ ان کی اسلامی معلومات کا حال کیا ہے تو ستر فیصد اساتذہ شب قدر، شب برات اور شب معراج میں فرق نہیں بتا سکے اس سے اندازہ ہوا کہ اسکول، کالج، یونیورسٹی میں اسلامیات کی تدریس کا معیار کیا ہے، لازمی دینی تعلیم برطانیہ کے اسکولوں میں بھی ہوتی ہے مگر انہی اسکولوں کے بیت الخلاء میں اسقاط حمل کے لیے غبارے بھی مہیا کیے جاتے ہیں، یہ دین ہے یہ دنیا یہ دو الگ دائرے ہیں، برطانیہ میں اور دیگر مغربی ممالک میں لازمی یا اختیاری (Compulsory/optional) دینی تعلیم، دینی زندگی، روحانیت کے حصول کے لئے نہیں محض ایک مضمون Subject کے طور پر ہے یعنی معلومات کا حصول، جس طرح دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں اسلامیات کا شعبہ العلم کے فروغ کے لئے نہیں، تاریخ سائنس، معاشیات اور نفسیات کی طرح کا ایک مضمون ہے لہٰذا یہاں جوتے پہن کر، بغیر وضو کے، حیض کی حالت میں اسلامی علوم حاصل کیے جاتے ہیں علم کے حصول کی پہلی شرط ادب ہے، ادب کے بغیر علم کا حصول ممکن نہیں اسی لئے انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے فارغ التحصیل ہونے والا کوئی عالم کسی دینی مدرسے، مسجد، میں استاذ اور امام بننے کے لئے تیار نہیں یہ کیسے عالم ہیں جو مسجد و مدرسے سے تعلق نہیں رکھنا چاہتے؟ غامدی صاحب نے پرویز مشرف کو تجویز دی تھی کہ مساجد میں اس یونیورسٹی کے علماء کو امام بنایا جائے انھیں گریڈ سترہ دیا جائے مگر ڈاکٹر منظور احمد نے بتایا کہ وہ تو یہ فریضہ انجام دینے پر آمادہ ہی نہیں، ظاہر ہے یونیورسٹی کی مابعد الطبیعات سے ایک دنیا دار ہی نکل سکتا ہے جسے صرف دنیا عزیز ہوتی ہے۔

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولوی نے فجر کی اذان نہ دی ہو

لہٰذا مسجد ہمیشہ مولوی کے پاس ہی رہے گی جدید مسلم دنیا دار یہاں آنا پسند نہیں کرتے، پاکستان میں تمام مساجد مدارس صرف اور صرف عوام کی محبت، محنت، توجہ اور دلچسپی سے چل رہے ہیں، عام لوگ عطیات، زکوٰۃ، صدقات مدارس اور مساجد کو دیتے ہیں جس سے یہ نظام چل رہا ہے، عطیات بہت بھاری نہیں ہوتے لہٰذا مدارس کے اساتذہ کی تنخواہیں بہت کم ہوتی ہیں، وہ احتجاج اس لیے نہیں کرتے کہ ان کو معلوم ہے کہ یہ سب کچھ مخلص مسلمانوں کا قائم کردہ رضا کارانہ نظام ہے، اس میں حکومت موجود نہیں ہے، رضا کارانہ کام میں احتجاج، مطالبات، تقاضے، شور، ہنگامہ نہیں ہوتا، جس پاکستان میں اکثر سرکاری افسر کبھی وقت پر دفتر نہیں آتے مگر لاکھوں روپے ماہانہ تنخواہ وصول کرتے ہیں لیکن اسی بدعنوان پاکستان میں ایک مؤذن جو ہماری آنکھ کھلنے سے پہلے اٹھ کر فجر کی اذان دیتا ہے جسے دیکھنے والا اور جس کی اذان سننے والا بھی کوئی نہیں ہوتا، یہ مؤذن اپنے اس فرض میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا یہ دین کی برکت ہے، وہ مؤذن، وہ فرض شناس، وہ باکردار وہ محنتی، ایمانی، روحانی، نورانی، ایمانی وجود، صبح سویرے یہ سخت ترین کام آندھی، طوفان، بارش، سردی اور گرمی میں چھ سات ہزار روپے کی تنخواہ میں نہایت دیانت داری سے انجام دیتا ہے، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مؤذن سوتا ہوا رہ گیا ہو، مسجد میں اذان نہ ہوئی ہو، مولوی نماز پڑھانے کے لیے مسجد نہ پہنچا ہو اور نماز نہ ہوسکی ہو، سرکاری اداروں کی مسجدوں میں تو کبھی کبھار یہ صورت حال پیدا ہوجاتی ہے کہ وہاں کا نظام ہی ایسا ہے سفارش پر بھرتیاں اور احتساب کا کوئی نظام نہیں لیکن گلی محلوں کی مساجد میں آج تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

مؤذن کا انتقال ہوگیا لہٰذا اذان نہ ہوسکی

۱۹۷۸ء میں مری کی ایک مسجد میں دسمبر کی برف باری میں ہم نے دیکھا کہ مؤذن نے اذان دینے میں دو منٹ کی تاخیر کردی تو ہنگامہ برپا ہوگیا، لوگ مؤذن کے گھر کی طرف دوڑے معلوم ہوا کہ مؤذن صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، اس لیے وہ اذان دینے تشریف نہیں لاسکے موت نے مولوی صاحب کے فریضے میں خلل پیدا کیا، نیند، بیماری، غربت، ذاتی مسائل کبھی اذان دینے کے عمل میں رکاوٹ نہ بن سکے، یہ ایمانی، نورانی، روحانی اور رحمانی قوت کا کرشمہ ہے، یہ ہے مذہب کی قوت جو دیانت داری کی اعلیٰ ترین سطح پر انسان کو پہنچا دیتی ہے۔

مولوی اس زمین پہ تزکیہ نفس کی زندہ علامت

مولوی کو گالیاں دینا، اس کی ذات میں کیڑے نکالنا بلکہ کیڑے ڈال دینا دنیا کا آسان ترین کام ہے مگر اس مولوی کی خدمات ایثار اور قربانی کو دیکھنے کے لیے خاص زاویہ نظر چاہیے، ہم اس زاویہ نظر سے محروم ہوچکے ہیں لہٰذا ہمارا نقطہ نظر مولوی کے بارے میں سراسر ظالمانہ، جارحانہ اور عدل سے محروم ہے، ہم صرف مشرقی صاحب کی طرح مولوی کا غلط مذہب جیسی کتابیں لکھ سکتے ہیں، اسے گالیاں دے سکتے ہیں مگر خود صبح فجر سے پہلے اٹھ کر نہ مسجد میں جھاڑو دے سکتے ہیں، نہ اذان دے سکتے ہیں، رمضان کے

مہینوں میں حفاظ کرام تراویح کی بیس رکعتیں نماز پڑھانے کے لیے افطار میں کھانے پینے میں کس قدر احتیاط برتتے ہیں، کتنا زبردست تزکیہ نفس کرتے ہیں، اللہ کی کیسی کیسی نعمتوں اور قسم قسم کے کھانوں کو چھوڑ کر نہایت قلیل غذا پر گزارہ کرتے ہیں تاکہ پیٹ صحیح رہے، بدہضمی نہ ہو، نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہو، تمام مقتدی پیٹ بھر کر آتے ہیں اور وقتاً فوقتاً رفع حاجت کے لیے یا وضو بنانے کے لیے بار بار صفیں چھوڑ کر جاتے ہیں، ہم نے اپنی زندگی میں رمضان میں کبھی کسی مولوی، عالم، حافظ کو پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر نماز و تراویح کے دوران وضو یا رفع حاجت کے لیے جاتے ہوئے نہیں دیکھا، یہ تزکیہ اللہ کے دین کے لیے عالم اور حافظ رمضان میں بھی کرتے ہیں اور پھر بھی گالیاں کھاتے ہیں، ہر گھٹیا انسان ان کے عیب بیان کرتا ہے ان کے اوصاف دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

علماء کے معاوضے کم کیوں ہیں؟ بنیادی سوال

سوال یہ ہے کہ ایک سرکاری ملازم چپراسی جس کی تنخواہ بیس پچیس ہزار روپے تک اور بے شمار مراعات الگ ہیں وہ اتنی جہالت کے باوجود بھاری تنخواہ کس علم کی اور کیوں لے رہا ہے اور علماء کی تنخواہیں اتنی کم کیوں ہیں؟ صرف اس لیے کہ ریاست علماء کو اور ان کے علم کو علم نہیں سمجھتی، صرف علم نہیں سمجھتی بلکہ ریاست جس علم کی سرپرستی کر رہی ہے، جس ٹیکنو سائنس، سائنٹفک امپیریل ازم اور سودی نظام کی سرپرست ہے، علماء ہی اس نظام کے اصل مخالف ہیں یا مستقبل میں کبھی بھی اس کے مخفی دشمن (Potential enemy) ہو سکتے ہیں، کیونکہ علماء ایمان، عقیدے، اقدار اور روایات کا ایک بالکل مختلف نظام رکھتے ہیں، ان کی علمیت بندگی اور توحید کے دائرے میں مقیم ہے جدید ریاست کی علمیت آزادی اور سرمایہ کے دائروں سے ظہور کر کے مساوات اور ترقی کو ممکن بناتی رہتی ہے، اسلامی علمیت مولوی کی دنیا کبھی آزادی اور ترقی کو ایمان اور عقیدے کے طور پر قبول نہیں کر سکتی، آزادی، بندگی اور آخرت کی نفی ہے۔ دو تصورات خیر ایک ساتھ نہیں چل سکتے آخر میں صرف ایک ہی تصور خیر باقی رہ جائے گا یہ تہذیبوں کی جنگ ہے لہٰذا اس نظام کے حاضر و موجود سے باہر جو بھی ہے وہ زندہ رہے یا نہ رہے، بھوکا رہے یا مر جائے یہ جدید ریاست کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔

علماء دینی مدارس اور پاکستانی ریاست کے تعلق کی نوعیت

پاکستانی ریاست مدارس مساجد علماء سے بالکل لاتعلق ہے وہ عرب ممالک کی طرح کم از کم مشاہروں کی حد تک بھی علماء کی سرپرستی کرنا پسند نہیں کرتی، کیونکہ اس کے باعث اس کے اخراجات بڑھ جائیں گے، اسے علماء عزیز ہی نہیں ہیں مگر یہ علماء پھر بھی اس ریاست کی ہر مشکل وقت میں مدد کرتے رہتے ہیں، یہ علماء کا اسلامی ریاست سے اخلاص ہے، علماء اور ریاست کے مابین ایک متضاد، متناقض، متخالف، مطلق رسہ کشی پر مبنی تعلق کی نوعیت پروفیسر عزیز احمد نے اپنی کتاب Islamic Modernism in India & Pakistan کے آخری تین ابواب میں نہایت تفصیل سے اور نہایت مدلل طریقوں سے تاریخی حوالوں کے ساتھ بیان کی ہے، علماء کے لئے اس کا مطالعہ حیرت کے دریچے کھول دے گا، اس کتاب کا اردو ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے برصغیر میں اسلامی جدیدیت کے نام سے کیا ہے جسے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے

شائع کیا ہے،ڈاکٹر عائشہ جلال کی کتابوں میں بھی اسلام، پاکستانی ریاست اور علماء کے تعلق کی نوعیت کے حوالے سے کئی قیمتی نکات ملتے ہیں، ادارہ مطالعہ تاریخ لاہور کے حسن جعفری نے علماء، مسلم لیگ اور قائداعظم کے موضوع پر جو کتابیں مرتب کی ہیں،ان میں بھی اس موضوع پر اہم حوالے موجود ہیں جن کا مطالعہ مفید رہے گا۔

ریاست علماء سے وفادار نہیں ہے مگر علماء ایک زبانی، کلامی، قانونی، دستوری، آئینی اسلامی ریاست کے وفادار ہیں، یہ صرف دینی رشتے کے باعث ہے یہ ایک ایسی ریاست ہے جس نے تمام صوبوں میں یہ قانون بنایا ہے کہ اٹھارہ سال سے پہلے کسی لڑکی کی شادی نہیں ہوسکتی اگر ہوئی تو ماں باپ دلہا سب جیل میں ہوں گے جرمانہ الگ، بلوغت کے باوجود عمر کی حد کا تعین اسلامی تاریخ میں کبھی نہیں کیا گیا۔

استعماری قوتوں نے شرعی قوانین سب سے پہلے کیوں ختم کیے؟

تمام استعماری قوتوں نے خواہ وہ ولندیزی، انگریز، فرانسیسی، ہسپانوی، المانوی یا یورپی و امریکی ہوں، انہوں نے افریقہ، ایشیا، عرب، ہندوستان، مصر اور دنیا میں بھر میں جہاں بھی قبضہ کیا اور نو آبادیات (Colonies) قائم کیں، وہاں روایتی، رواجی، مقامی، تاریخی، اسلامی، شرعی مذہبی قوانین کو اسی لیے ختم کیا کہ ان قوانین کے ذریعے ریاست کا کامل جبر اور تسلط عوام پر براہ راست قائم نہیں ہوسکتا تھا، شرعی قوانین میں بے پناہ لچک تھی اس میں ریاست کی دخل اندازی کم سے کم تھی، قاضی عدالتوں کے ذریعے قاضی اور مفتی کے اختیارات بہت زیادہ تھے عوام کا براہ راست تعلق قاضی، مفتی اور علماء سے ہوتا تھا، ریاست، حاکم، امیر، خلیفہ، سلطان کے اختیار و اقتدار کا غلبہ عوام تک نہیں تھا، ہر جگہ صرف اور صرف علماء کی حکمرانی تھی ترکی میں ۱۹۰۱ء تک عدالتیں مساجد میں لگائی جاتی تھیں، عدل لوگوں کی براہ راست رسائی میں تھا، جدید ریاست میں قانون اوپر سے نیچے آتا تھا، یہاں نیچے سے اوپر جاتا تھا، علم اور عدل کے ادارے امارت کی دسترس میں نہیں صرف اور صرف علماء کی دسترس میں تھے، حکمرانوں کا دائرہ اختیار بہت محدود تھا، استعماری قوتوں نے مسلم ممالک کو غلام بنانے کے بعد علم اور عدل، درسگاہ اور عدالت کو علماء سے چھین کر حکمرانوں کے سپرد کر دیا، علم و عدل علماء سے الگ ہوئے تو بحر و بر میں فساد برپا ہوگیا، انیسویں صدی میں استعماری قوتوں کے غلبے کے بعد جدید ریاست کی طاقت بڑھانے کے لیے دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف طریقے اختیار کیے گئے شرعی قوانین کو بھی اسی لیے ختم کیا گیا کہ شریعت، قاضی اور اسلامی عدالت ریاستی جبر سے عوام کو محفوظ کرتی تھی اور عدل، لوگوں کو بغیر کسی معاوضے کے گھر کی دہلیز پر مسجد کے صحن میں ہر وقت آسانی سے میسر تھا، جدید ریاست نے خواہ وہ اسلامی ہی کیوں نہ ہو، شرعی قوانین کو من و عن اس لیے نافذ نہیں کیا کہ اس نظام عدل میں ریاست، حکومت اور حکمران کی گرفت عوام پر سرے سے قائم نہیں ہوتی، قوت، طاقت، اختیار اور اقدار عالم، قاضی اور مفتی کے پاس ہی رہتا ہے، قانون کا نفاذ مغرب کی طرح اوپر سے نیچے کی طرف نہیں ہوتا بلکہ نیچے سے اوپر جاتا ہے اسی صورت میں ریاست جابر نہیں ہوسکتی لہٰذا اس کے جبر کو مسلط کرنے کے لیے شرعی قوانین یا تو ختم کر دیے گئے یا ان کو سیکولر قانون میں ڈھال کر آئین سازی کے ذریعے سیکولر بنا دیا گیا اور ان کے نفاذ کے لیے شرعی عدالت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی۔

علماء پاکستانی ریاست سے اتنی محبت کیوں رکھتے ہیں؟

صرف ریاست کا یہ زبانی دعویٰ کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے ریاست نے کلمہ پڑھ لیا ہے، پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا، پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ اسلام ہماری زندگی ہے، علماء اس دعوے پر یقین رکھتے ہیں لہٰذا علماء ستر سال سے اس ریاست کے شانہ بشانہ کھڑے ہوئے ہیں، وہ اسے مدینہ کے بعد دنیا کی پہلی اسلامی نظریاتی ریاست سمجھ کر اپنی جان، مال اسلام کے قلعہ (پاکستان) پر نچھاور کر رہے ہیں، ریاست سے ان کی وفاداری کی بنیاد مال ومتاع، درہم ودینار، جاہ وحشم، لوح وقلم اور طبل وعلم نہیں صرف دینی عقیدہ ہے، علماء اس ریاست کے تحفظ کے لیے سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہیں وہ نہ ستائش چاہتے ہیں، نہ صلہ، نہ کوئی معاوضہ لیکن ریاست کا رویہ علماء کے ساتھ جو کچھ ہے، اس کے لیے Kelson کی کتاب Pure Theory of state and law کا مطالعہ کیا جائے جس سے معلوم ہوگا کہ ریاست کا رویہ علماء سے ایسا کیوں ہے؟

مدرسہ چھوڑتے ہی علماء کے معاوضے کیوں بڑھ جاتے ہیں؟

یہاں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ علماء جو اپنے مدرسوں میں اتنی کم تنخواہ پاتے ہیں مگر یہی علماء اپنے مدرسے کی معمولی تنخواہ چھوڑ کر اپنے اسی علم، اسی جسم کے ساتھ اسی ریاست کے اداروں (اسکول، کالج، یونیورسٹی، تحقیقی تصنیفی ادارے، کارپوریشن، مالیاتی اداروں) یا نجی شعبوں میں خدمات انجام دینے پر آمادہ ہو جائیں تو اچانک علماء کی تنخواہیں، مراعات اور سہولیات تیزی سے بڑھنا شروع ہو جاتی ہیں، نظام حاضر وموجود کا حصہ بنتے ہی ریاست، سرکاری اور غیر سرکاری ادارے انہی علماء کو نوازنے لگتے ہیں اگر یہی عالم جو کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہے اور وہاں سالانہ لاکھوں روپے تنخواہ اور بے شمار مراعات سہولیات حاصل کر رہا ہے، اچانک یونیورسٹی کو چھوڑ کر دوبارہ مدرسے میں چلا جائے تو ریاست یا نجی ادارے اسے تمام مالی مراعات سے محروم کر کے اس بات کی سزا دیتی ہے کہ وہ اس نظام سے باہر کیوں چلا گیا، اس نظام کی خدمت سے کیوں الگ ہو گیا؟ علماء کا مکان (جگہ Place) بدلنے سے ان کا مقام (معاشی مقام Status) کیوں بدل جاتا ہے یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی، کیا ایک اسلامی ریاست ایسا کر سکتی ہے؟

اسلامی خلافت میں علماء اور امارت اسلامی کا تعلق

واضح رہے کہ اسلامی خلافت میں علماء کو جاگیریں دی جاتی تھیں، اچھے مشاہرے اور معاوضے ملتے تھے، عطایا بھجوائے جاتے تھے، ریاست کا پورا نظام علماء کے مشورے سے چلتا تھا، برنارڈ لوئیس نے (جس کا دعویٰ ہے کہ وہ آخری مستشرق ہے، عالم اسلام اور خلافت عثمانیہ پر سینکڑوں کتابوں کا مصنف ہے) اپنی کئی کتابوں میں بتاتا ہے کہ خلافت عثمانیہ کا خلیفہ مطلق العنان نہیں تھا، وہ ہر فیصلہ کرتے ہوئے بے شمار لوگوں اور طبقات سے مشورہ کرتا اور آخری مشورہ علماء اور مفتی اعظم سے کرتا تھا اس سلسلے میں اس نے ترکی میں مقیم کئی مغربی سفارت کاروں کے وہ مراسلے بھی شائع کیے ہیں جو وہ اپنے ملکوں کے بادشاہ کو لکھتے تھے اور اس میں بتاتے تھے کہ بادشاہ

کوئی فیصلہ خود نہیں کرتا اس لیے ہمیں مراعات کے حصول میں انتظار کے لمحات برداشت کرنا ہیں، خلافت اسلامیہ میں علماء کے لیے وقف کا پورا نظام قائم تھا، علماء ان کی نگرانی کرتے تھے ترکی میں وقف کی اراضی املاک کو جدید ترقی ،ٹرام، ریل گاڑی کی سہولیات اور جدید ریاست کی مادی ترقی کی فراہمی میں لگایا گیا اور علماء کو ان تمام ذرائع آمدنی سے محروم کیا گیا وائل اے حلاق نے Shariah Theory and Practice میں اوقاف کے موضوع پر نفیس گفتگو کی ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں نے تمام اوقاف، املاک جو علماء اور مدارس ومساجد سے ملحق تھیں ان پر قبضہ کر کے علماء کو معاشی طور پر بد حال کر دیا، اس کے باوجود علماء دین کی خدمت میں مصروف رہے یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے، خلافت اسلامیہ میں سب سے بڑے عالم کو بادشاہ اپنے برابر جگہ دیتا تھا، تمام روایتی تہذیبوں میں علم الٰہی اور علم آخرت کے عالم کو ہی عالم تسلیم کیا جاتا تھا، علوم عقلیہ اور سائنسی علوم تمام روایتی تہذیبوں میں علوم کی تلچھٹ سمجھے جاتے تھے، کسی تہذیب میں سائنس دان کی کوئی عزت نہیں تھی، صرف دنیا کمانے والوں کو عالم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا، اسلامی تاریخ میں جتنے بڑے سائنس داں ہیں وہ یا تو معتزلی ہیں یا ملحد ہیں یا اسلام کے شیعہ مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

ریاست، علماء اور مدارس کی سرپرستی کیوں نہیں کرتی ؟

لہٰذا ایک ایسا معاشرہ اور تہذیب جہاں ہر شے صرف اور صرف سرمایے (capital) میں اضافے کے پیمانے پر پرکھی جائے کیوں کہ اصل چیز ترقی ہے، ترقی سے قوت ملتی ہے، ترقی ہی مقصود ہے اور ترقی ہی اصل الخیر ہے جو ترقی نہ کر سکے وہ جاہل ہے تو ظاہر ہے ایسے معاشرے ایسی ریاست ایسی مارکیٹ میں علم دین اور اس دین کے عالم کی کیا قدر و قیمت متعین ہوگی، جب قدر Value کا تعین صرف مادی، مالی، اقتصادی، معاشی، جسمانی، طبعی ہو اور ہر قدر صرف اور صرف قدر تبادلہ Exchange Value سے ہی معین (determin) ہوتی ہے تو علم دین کے ذریعے کیا خریدا اور کیا بیچا جا سکتا ہے؟ کیا درآمدات برآمدات ہو سکتی ہیں؟ ظاہر ہے کچھ بھی نہیں، لہٰذا ایسے علم اور ایسے علم کی جدید ریاست میں کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہ جاتی، جو درآمد برآمد (Export/Import) نہ ہو سکے، جو علم فروخت نہ ہو سکے جس کی عالمی مارکیٹ میں طلب نہ ہو جس علم کے ذریعے دولت، قوت، سرمایہ میں لامتناہی اضافہ کیا نہ جا سکے لہٰذا ایسا علم، علم نہیں جہالت سمجھا جاتا ہے، اسی لیے ریاست، حکومت کوئی علم دین کی سرپرستی نہیں کرتے اس کی جگہ سائنس کا علم لے لیتا ہے لہٰذا ریاست پہلی جماعت سے سائنس کی تعلیم لازمی کر دیتی ہے سرکاری اسکولوں میں اس کی مفت تعلیم دی جاتی ہے اس کے لیے اساتذہ بھرتی کیے جاتے ہیں سائنس کے اساتذہ کی تنخواہیں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔

دینی علوم کے علماء کی عزت ہمارے معاشرے میں

کراچی کے بہت سے اعلیٰ سیکولر انگریزی اسکولوں میں اور اعلیٰ مذہبی انگریزی اسکولوں میں اسلامیات اردو اور مطالعہ پاکستان کے اساتذہ کی تنخواہیں بہت کم ہوتی ہیں سب سے زیادہ تنخواہیں انگریزی، سائنس اور ریاضی کے اساتذہ کی ہوتی ہیں، ڈیفنس ہاؤسنگ

سوسائٹی کے بعض نجی اسکولوں میں اسلامیات اردو کے اساتذہ کو اچھوت سمجھ کر ان کا کمرہ (Staff Room) دوسرے مضامین کے اساتذہ کے کمرے سے بالکل الگ کر دیا جاتا ہے، دو مختلف سطحوں کے اساتذہ کے اسٹاف روم بھی الگ ہوتے ہیں، یہ اسلامی ریاست میں اسلام اردو اور مطالعہ پاکستان کے اساتذہ کی اسلامی اسکولوں میں عزت ہے، جس علم کی عزت اس طرح ہوگی طلباء اس عالم اور اس علم کے اساتذہ کی کتنی عزت کریں گے؟

یہی حال ہمارے گھروں اور معاشرے میں دینی تعلیم قرآن کے اساتذہ کا ہے، سب سے کم تنخواہ سب سے اعلیٰ ترین کتاب القران الکریم کے استاد کو دی جاتی ہے، پانچ سو یا ہزار روپے بس اکیسویں صدی میں ہم قرآن کے استاد کو اس سے زیادہ تنخواہ دینا پسند نہیں کرتے اور پوچھتے ہیں کہ اسلام دنیا میں سربلند کیوں نہیں ہے؟ اگر گھر میں دعوت ہو، مہمان ہوں، تو قرآن کے استاد کو چھٹی دے دی جاتی ہے کہ مولوی صاحب! آج ہم مصروف ہیں مگر انگریزی اور سائنس کا استاد آجائے تو اسے چھٹی نہیں دی جاتی قرآن کا سبق غیر اہم ہے انگریزی اور سائنس کا سبق سب سے اہم ہے اس رویے کے بعد اگر نوجوان نسل سیکولر بن رہی ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یعنی جو علم سرمایہ نہ پیدا کر سکے وہ علم نہیں لہٰذا مغرب میں سائنس دانوں کو کم معاوضہ ملتا ہے کھلاڑی، رنڈی، فلم اسٹار، سٹے باز کو اربوں روپے ملتے ہیں۔

عالم دین یونیورسٹی میں ملازمت کیوں پسند نہیں کرتا؟

ہمارے ایک نہایت محترم دوست عالم دین جو کئی زبانیں جانتے ہیں اور مفتی بھی ہیں مفتی صابر حقانی صاحب، وہ ایک مرتبہ راقم کے ذاتی کام کے سلسلے میں بلوچستان یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر اقبال خٹک کے پاس تشریف لے گئے جو راقم کے دوست بھی ہیں اور وہاں سنڈیکیٹ کے رکن اور انجمن اساتذہ کے عہدے دار بھی ہیں خٹک صاحب ہمارے دوست عالم دین سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں پیش کش کی کہ آپ بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں اسسٹنٹ پروفیسر کا عہدہ قبول کر لیں آپ کل سے کام پر آجائیں، خٹک صاحب نے شیخ الجامعہ سے بات بھی کر لی وہ بھی اتنے فاضل شخص کو فوری ملازمت دینے پر آمادہ ہو گئے لیکن مفتی صابر صاحب نے انکار کر دیا اور ان کی پیش کش کو مسترد کر دیا مفتی صاحب کی مدرسے میں تنخواہ صرف دس ہزار روپے ہے ان کے اوقات کار بارہ گھنٹے ہیں اس کے گھر والوں کی تعداد دس ہے، دس ہزار روپے میں دس گھر والوں کو پالنے والے مفتی صاحب نے ستر ہزار روپے کی ملازمت، مستقبل کی ترقی، بہترین رہائش گاہ، سہولیات، مراعات، پنشن، گریجویٹی، علاج معالجہ سب کچھ چھوڑ دیا، خٹک صاحب نے آخر میں زچ ہو کر پوچھا مفتی صاحب! صرف یہ بتا دیجیے کہ اس میں کیا ہرج ہے؟ مفتی صاحب نے فرمایا میں مفتی، مولوی اور عالم ہوں میں اپنے مدرسے میں دین کا علم دیتا ہوں آپ کے مخلوط تعلیمی ادارے میں کس طرح پڑھا سکتا ہوں، اگر یہ مخلوط نہ ہوتب بھی یہاں ایم اے کے لیے آنے والے طلباء نہ عربی جانتے ہیں نہ فارسی وہ تو صرف ڈگری کے لیے آتے ہیں ان کو پڑھا کر اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کروں، مدرسے میں تو طلباء علم کی خاطر آتے ہیں، جدید تعلیمی اداروں سے علماء کے فاصلے اسی لیے زیادہ ہیں، دس ہزار روپے کے مشاہرے پر جس شخص کو اکیسویں

صدی کے پاکستان میں نفس مطمئنہ حاصل ہے اس سے بڑا ولی صوفی، درویش کون ہوسکتا ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں معاشرے میں اہل اللہ نظر ہی نہیں آتے حالانکہ اہل اللہ ہر مسجد ہر مدرسے میں موجود ہیں ان کو دیکھنے اور پانے کے لیے اللہ والوں کی آنکھ بھی تو چاہیے جدید تعلیم میڈیا، چکاچوند نے ہمیں اس آنکھ اس نظر اور اس نقطۂ نظر سے بھی محروم کر دیا ہے، کسی قوم پر اللہ کا عذاب صرف آسمانوں سے ہی نہیں آتا مختلف طریقوں سے بھی آتا ہے عذاب الٰہی کی بدترین شکل یہ ہے کہ کوئی قوم محرومی فکر صحیح کے مرض میں مبتلا ہو جائے المیہ ہے کہ یہ امت فکر صحیح سے محروم ہو رہی ہے اس لیے علماء کی قدر و منزلت کم ہو رہی ہے۔

لوگ عبادت کریں یا نہ کریں یہ ریاست کا مسئلہ نہیں

جن ممالک میں علماء کو اچھے معاوضے ملتے ہیں جلد یا بدیر وہ بھی ختم ہو جائیں گے، ان ملکوں میں سرمایہ داری جمہوریت اور لبرل ازم پوری طرح جڑ نہیں پکڑ سکے، رفتہ رفتہ وہاں بھی جمہوریت آئے گی، تو علماء کی عزت ختم ہو جائے گی، جدید لبرل، سیکولر، سرمایہ دارانہ ریاست، مذہب کو فرد کا ذاتی معاملہ سمجھتی ہے، اسے مساجد مدارس کی تعمیر، ان کی تزئین آرائش، اخراجات سے کوئی دلچسپی نہیں لوگ عبادت کرنا چاہتے ہیں تو کریں، مسجد کھلی رکھیں یا بند کرنا چاہیں تو بند کر دیں، ریاست کے لیے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، مدرسہ اور مسجد رہے یا نہ رہے، یہ عوام کا ذاتی مسئلہ تو ہوسکتا ہے، ریاست کا اس سے تعلق نہیں عبادت، نیک اعمال ذاتی مسئلہ ہے قومی ملی مسئلہ نہیں لوگوں کو نیک بنانا ریاست کا کام نہیں، لوگ جنت میں جائیں یا جہنم میں ان کی مرضی بس وہ اسکول ضرور جائیں، ریاست اس کے لیے لازمی تعلیم کا قانون بنا سکتی ہے، بناتی ہے، نافذ بھی کرتی ہے، کئی ملکوں میں الیکشن میں ووٹ دینا بھی لازمی ہے، لیکن کسی ملک میں عبادت کرنا لازمی نہیں ہے، صبح سویرے بچے کو مار پیٹ کر تھپڑ، جوتے، مکے، لاتیں، گھونسے، ٹھڈے مار کر اسکول بھیجنا عین آزادی Freedom ہے، اسے کوئی جبر نہیں کہتا، کیوں کہ یہ آزادی کا جبر (Tyrrany of Freedom) ہے اور چونکہ آزادی ہمارا عقیدہ ایمان ہے، لہٰذا عقیدے کا جبر (Compulsion of Faith) جبر نہیں ہوتا، اسی جبر سے آزادی ملتی ہے اس جبر کے خلاف دنیا میں کوئی قانون نہیں کوئی NGOs اس جبر ظلم پر احتجاج نہیں کرتی کیوں کہ یہ سرمایہ دارانہ معاشرے مارکیٹ اور ماڈرن ازم کا جبر ہے NGOs سرمایہ دارانہ نظام کی ایجنٹ ہیں اگر کہیں بچوں کو صبح مار پیٹ کر مسجد بھیجا جا رہا ہوتا تو میڈیا NGOs ہنگامہ کر دیں گے یہ مذہب کا جبر (Compulsion of Religion) ہے، یہ قبول نہیں، آزادی کا جبر (Tyrrany of Freedom) کیوں قبول ہے؟ کیوں کہ آزادی عقیدہ ایمان ہے اور ایمان عقیدے سے متعلق کوئی سزا، سختی، ظلم محسوس نہیں ہوتا یہ عقیدے کی قیمت ہوتی ہے عصر حاضر کا عقیدہ اصلاً آزادی ہی ہے۔

لوگ جنت جہنم جہاں مرضی جائیں یہ ریاست کا مسئلہ نہیں

معاملہ صرف یہی نہیں ہے کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ پاکستان میں ٹرینیں نماز کے اوقات میں رک جائیں اور لوگ نماز پڑھ لیں، ٹرانسپورٹ اذان پر رک جائے، ہوائی جہاز نماز کے اوقات کا خیال رکھ کر پرواز شروع کریں، اے لیول، او لیول کے امتحانات ہوں تو اس میں

نماز کا وقفہ رکھا جائے، ظاہر ہے کبھی نہیں کیوں کہ اس سے سرمایہ دارانہ عمل متاثر ہوگا، ترقی متاثر ہوگی، نماز پڑھو نہ پڑھو، تمہاری مرضی ریاست کا اس سے کیا تعلق؟ جان لاک نے اپنے خط Letter of Tolerance میں یہی لکھا تھا کہ مجسٹریٹ، حکومت، بادشاہ کا کام یہ نہیں کہ وہ بتائے کہ لوگ کہاں جائیں جنت یا جہنم؟ جب خدا نے اپنے بندوں کو خود آزادی دی کہ وہ جہاں چاہے جائیں جنت یا جہنم تو کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں پر کوئی مذہبی جبر مسلط کرے یعنی عوام جنت میں جائیں یا جہنم میں، یہ ریاست کا مسئلہ نہیں کیوں کہ لبرل ازم، انسانی حقوق کے منہاج (Human Rights Discourse) میں جنت جہنم کچھ نہیں ہوتے یہ صرف لوگوں کے واہمے ہیں مغرب ارسطو کی اتباع میں ابدیت دنیا (Eternity of world) کے عقیدے پر ایمان رکھتا ہے، لہٰذا اسی دنیا کو بس جنت بنانا چاہتا ہے۔

مسجد، مدرسہ، اذان اور ایمان علماء کے دم سے

یہ اذان، یہ نماز، یہ اسلام آج بھی صرف اور صرف علماء کے دم سے قائم ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک مدارس مساجد اور علماء کے دم سے قائم ودائم رہیں گے صبح محشر تک یہ زمین اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات سے منور ومعمور رہے گی علماء کی کمزوریوں خامیوں کے باوجود وہی اس دین کے اصل نگہبان ہیں، تمام توقعات انہی سے ہیں ان کے وجود کے بغیر اسلام زندہ نہیں رہ سکتا حقیقت یہی ہے کہ علماء ہی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند اور ان کے علم کے اصل وارث ہیں، ان کی عزت، ان سے محبت، ان کی تقلید، ان کی اتباع ہم سب کا دینی فریضہ ہے جو معاشرہ اور تہذیب علماء کی عزت نہیں کرتی یا عزت تو کرتی ہے مگر ان کے حکم کی تعمیل نہیں کرتی، وہ تہذیب جلد یا بدیر صفحہ ہستی سے مٹا دی جاتی ہے، یا عبرت کی ایک شرمناک داستان کے اوراق کی طرح پارہ پارہ کر کے بکھیر دی جاتی ہے۔

اندلس اس داستان کا ایک ورق ہے اندلس کے سب سے بڑے امام اور خطیب نے الحمراء محل کی تعمیر کے خلاف جمعہ کی نماز میں خلیفہ وقت کے سامنے ایک معرکہ آراء تقریر کی یہ تقریر تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے، اس نے خلیفہ کو یاد دلایا کہ الحمراء کی تعمیر، عاد، ثمود، فراعنہ مصر کا تمدن ہے، یہ اللہ کو پسند نہیں ہے جو ان کی اتباع کرے گا اللہ اپنی مشیت کے مطابق ان کے آثار، عمارات، کو محفوظ رکھے گا، لیکن ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا خلیفہ نے اس عظیم عالم کے خلاف کوئی کارروائی تو نہیں کی، لیکن الحمراء کی تعمیر کا کام ترک نہیں کیا الحمراء، مسجد قرطبہ، اندلس کی گلیاں، بازار، محلے عمارتیں سب محفوظ ہیں مسلمان نہ موجود ہیں نہ محفوظ، مسلمانوں کی حفاظت اسلام اور ایمان کرتا ہے، عمارتیں، آثار، مظاہر سائنس نہیں کرتے اگر ایسا ہوتا تو اندلس کے مسلمان جو سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور سائنس میں سب سے آگے تھے، کبھی فنا نہ ہوتے آب بقاء پی لیتے افسوس ہم ابھی تک علماء کی تقلید کے لیے تیار نہیں۔

مولانا مدثر جمال تونسوی
استاذ الحدیث جامعۃ الصابر بہاولپور

علمِ مقاصدِ شریعت

ایک تعارف اور ایک جائزہ

اللہ تبارک وتعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اُس کریم ذات نے امت محمدیہ علی صاحبہا الف صلوۃ وتحیۃ کو قرآن کریم اور سنت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے دو انمول علمی جواہرات عطا فرمائے اور بلاشبہ قرآن کریم کے ساتھ حکمت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی کے مثل اور بعض وجوہ سے اس سے بڑھ کر ہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۱۷۶ھ) نے صراحت کی ہے:

> علوم یقینیہ میں سب سے معتمد اور فنون دینیہ کے لیے بنیاد ''علم حدیث'' ہے..... یہ احادیث شریفہ تاریکی میں روشن چراغ اور ہدایت کی واضح علامات ہیں جو ستاروں میں چودھویں کے چاند کی مانند ہیں، جس نے ان کا اتباع کیا اور انہیں محفوظ کیا، اسی نے رُشد وہدایت پائی اور وہ بے حساب بھلائی سے ہمکنار کر دیا گیا اور جس نے ان سے اعراض اور روگردانی کی وہ گمراہ ہوا اور ہلاکت کے گڑھے میں جا گرا اور سوائے نقصان وبربادی کے کچھ اُس کے ہاتھ نہ آیا(۱)

علم حدیث کی اس اہمیت کے بعد شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے یہ بتایا ہے کہ اس علم کی متعدد شاخیں ہیں اور ان میں سب سے بلند مرتبہ اس علم کا ہے جسے علم المقاصد یا علم اَسرار الدین کا نام دیا جاتا ہے۔

اس علم کا مقام ومرتبہ واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> میرے نزدیک تمام علومِ حدیث میں سب سے دقیق، سب سے گہرا، سب سے بلند، سب سے برتر، سب سے بلند درجے ومرتبے والا علم علم اَسرار الدین ہے، جو احکام شرعیہ کی حکمتوں اور علّتوں سے اور اَعمال اسلامیہ کی خصوصیات کے اَسرار ورُموز سے بحث کرتا ہے(۲)

چنانچہ اسی علم کی تبیین وتشریح اور مباحث کی تسہیل وترویج کے لیے حضرت حکیم الامت، ابوالفیض شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تلمیذ رشید مولانا محمد عاشق الٰہی پھلتی نور اللہ مرقدہ کے بے حد اِصرار پر شہرت دوام پانے والی کتاب حجۃ اللّٰہ البالغۃ تصنیف فرمائی جو اس علم وفن کی معتبر کتابوں میں سرفہرست مقام رکھتی ہے۔

اس مقالے میں اسی علم وفن کا ایک مختصر تعارف اور اس کے بارے میں کچھ لازمی معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اسے میرے لیے اور تمام قارئین کے لیے نفع مند بنائے۔ آمین

علم المقاصد کی تعریف

مقاصدِ شریعت ایک باقاعدہ دینی وشرعی علم اور فن کا نام ہے جیسا کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، کلام، اور منطق وغیرہ مستقل علوم وفنون کے نام ہیں، اس علم کا نام دو لفظوں سے مرکب ہے (۱) مقاصد (۲) شریعت، اولاً دونوں لفظوں کا الگ الگ معنی جاننا چاہئے۔

مقاصد کا لغوی معنی

مقاصد: یہ مقصد کی جمع ہے اور فعل قصد سے مصدرِ میمی ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: قصد یقصد قصدا و مقصدا .....اس لفظ کے متعدد لغوی معانی ہیں:

مقصد بمعنی اعتماد اور توجہ، قرآن کریم میں ہے: وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ (۳) بھروسہ، اعتماد اور توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، میانہ روی جو افراط وتفریط سے پاک ہو، قرآن کریم میں ہے: وَ اقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (۴) اپنی چال میں میانہ روی رکھو (جس میں نہ تو سستی وکاہلی ہو اور نہ ہی متکبرانہ ٹھاٹھ باٹھ ہو) اسی طرح حدیث مبارک میں ہے: القصدَ ، القصدَ تَبْلُغُوا (۵) میانہ روی سے دین پر چلتے رہے، منزل تک پہنچ جاؤ گے

شریعت کا لغوی معنی

لغت عرب میں پانی کے منبع اور سرچشمہ کو ''شریعت'' کہتے ہیں، نیز دین، ملت، طریقہ، سنت اور منہاج پر بھی شریعت کا لفظ بولا جاتا ہے، یہ بھی واضح رہے کہ شریعت، شرع اور شِرعة تینوں لفظ ہم معنی ہیں۔

جس طرح پانی انسانی زندگی کی بقاء اور تروتازگی کے لیے ناگزیر ضرورت ہے، اسی طرح دین اسلام انسانوں کی روحانی اور مذہبی زندگی کی بقاء اور اصلاح کا سرچشمہ اور منبع ہے، اسی دین اسلام سے انسانوں کی دنیوی اور اُخروی فلاح وبہبود اور اللہ تعالیٰ کے ہاں رضامندی سے جڑی ہوئی ہے، اس مناسبت سے انسانی زندگی کی ایک مادی ضرورت اور منبع پانی کے سرچشمے کے لیے جو لفظ ''شریعت'' بولا جاتا تھا اُسی لفظ کو انسانوں کی دینی، روحانی اور مذہبی زندگی کے سرچشمے اور منبع کے لیے استعمال کیا گیا۔

مقاصد شریعت کا اصطلاحی معنی

متقدمین اہل علم کے ہاں اس علم وفن کا مستقل وجود نہیں تھا، بلکہ عموماً تمام دینی علوم اور خصوصاً اصول فقہ کے ذیل میں اس علم

وفن سے بحث کی جاتی تھی، چنانچہ مصلحت، حکمت، علت، منفعت، فساد، اغراض، غایات، اہداف اور اسرار وغیرہ کی جو تعبیرات علوم دینیہ میں ملتی ہیں وہی مباحث مستقل موضوع اختیار کر کے ایک مستقل علم وفن کی شکل اختیار کی گئیں جس کی تعریف اور اجمالی تعارف اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، عصر حاضر میں اس موضوع پر ایک مفید ترین کتاب تحریر کرنے والے شیخ نور الدین الخادمی نے اس علم کی جامع ترین تعریف کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

المقاصد هی المعانی الملحوظة فی ا لاحکام الشرعیة و المترتبة علیها سواء اکانت تلك المعانی حکماجزئیة ام مصالح کلیة ام سمات اجمالیة وهی تتجمع ضمن هدف واحد ، هو تقریر عبودیة اللّٰه و مصلحة الانسان فی الدارین(۶)

مقاصد شریعت سے مراد وہ اَہداف بھی ہیں جو شرعی اَحکام میں ملحوظ رکھے گئے ہیں اور وہ بھی ہیں جو اُن شرعی احکام پر مرتب ہوتے ہیں، چاہے وہ اَہداف جزوی حکمتیں ہوں، کلی مصلحتیں ہوں یا محض اجمالی نشانیاں ہوں اور یہ سب اَہداف اپنے ضمن میں ایک ہی ہدف رکھتے، اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اظہار اور انسان کے لیے دنیا اور آخرت میں فائدہ مندی

خلاصہ کلام یہ کہ ایک حکیم وخبیر ذات باری تعالیٰ نے شرعی احکام میں اپنے بندوں کے لیے جو فوائد رکھے ہیں وہی مقاصد شرعیہ ہیں، مثلاً :روزے کا فائدہ حصول تقویٰ بیان کیا گیا ہے تو یہ تقوی کا حصول مقصد شرعی ہے، جہاد کا ایک مقصد جارح دشمن کی جارحیت کو دفع کرنا ہے تو یہی شرعی مقصد کہلائے گا، نکاح کے مقاصد میں اپنی شرمگاہ اور نظروں کی حفاظت اور اولاد کا حصول پیش نظر ہے تو یہی چیزیں شرعی مقاصد کہلائیں گی، الغرض شرعی مقاصد اور مصالح کا باب بہت وسیع ہے مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ یہ سب مقاصد اور مصالح آخر کار اللہ تعالیٰ کی بندگی اور بندوں کی دنیوی اور اُخروی سعادت مندی سے ہی جڑ جاتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے۔

وَ لَقَدۡ بَعَثۡنَا فِی کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ(۷)

ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجے (یہ پیغام دے کر کہ) ایک اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچ کر رہو۔

مقاصد شریعت کی بات کو دیگر بعض اہل علم نے یوں بھی بیان کیا ہے کہ شریعت کے مقاصد بنیادی طور پر دو ہی ہیں ایک دینی اور دنیوی منافع اور مصالح کا حصول دوسرا دینی اور دنیوی نقصانات اور فسادات کا دفعیہ، یہ الگ بحث ہے کہ اگر کبھی دینی اور دنیوی منفعت میں ٹکراؤ پیدا ہو رہا ہوں تو پھر کس منفعت کو ترک کر دیں گے اور کس منفعت کو ترجیح دیں گے؟ اگرچہ اس میں اصولی اور عمومی ضابطہ یہی ہے کہ دینی منفعت کو ہی ترجیح دیں گے، لیکن بہر حال یہ موضوع ایک الگ مستقل اور مفصل ترین بحث ہے جو اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے کیوں کہ فی الحال ہم اس علم وفن کی مبادیات اور تعارف پر گفتگو کر رہے ہیں۔

اب تک کی بحث سے ہم نے اس علم وفن کی تعریف جان لی اور ساتھ ہی اس کی غرض وغایت بھی جان لی یعنی کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا ثبوت اور انسان کی دینی ودنیوی سعادت مندی۔

مقاصد شریعت کی اَقسام

اس علم وفن کی تعریف اور غایت جاننے کے بعد اب اس کی اہم ترین اقسام جاننا ضروری ہے، اس فن کے اولین معمار امام ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ الغرناطی الشاطبی (متوفی ۷۹۰ھ) کی مباحث سے بطور خلاصہ وانتخاب ان اقسام کو بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) مصالح ضروریہ: اُن اَہداف وغایات کو کہا جاتا ہے کہ اگر وہ ہاتھ نہ آئیں تو انسان کی دنیا یا آخرت برباد ہو جائے، مثلاً اگر نکاح اور نماز پڑھنا کہ اگر نکاح کی قدرت ہو اور کوئی مانع بھی نہ ہو اس کے باوجود نکاح نہ کیا جائے تو دنیا بگڑ جاتی ہے اور اگر شرعی عذر کے بغیر نماز ترک کر دی جائے اور اس سے منہ موڑ لیا جائے آخرت برباد ہو جاتی ہے، یہ شرعی مقاصد کی سب سے اولین قسم ہے، گویا کہ شریعت نے احکام شرعیہ میں ان مصالح کو سب سے مقدم رکھا ہے اور یہ پانچ مصالح ہیں جنہیں کلیات خمسہ کی اصطلاح سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، یہ کلیات خمسہ یا مصالح ضروریہ درج ذیل ہیں ☆ حفظ الدین یعنی دین کی حفاظت ☆ حفظ النفس یعنی انسانی جان کی حفاظت ☆ حفظ العقل یعنی انسانی عقل کی حفاظت ☆ حفظ النسل یعنی انسانی نسل کی حفاظت ☆ حفظ المال یعنی انسان کے مال کی حفاظت۔

گویا اب یوں سمجھئے کہ شریعت نے جتنے بھی احکام دیے ہیں ان سب میں ان پانچ مصلحتوں میں سے کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور موجود ہوگی اور بعض میں دو تین یا سب مصلحتیں بھی موجود ہو سکتی ہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ شریعت کا کوئی حکم ایسا ہو جس میں ان پانچ باتوں میں سے کوئی بھی بات موجود نہ ہو، ان پانچوں باتوں کی اصل اور بنیاد خود قرآن مجید ہے جو اس فن کے ماہرین اور ماہرین قرآن پر مخفی نہیں، نیز یہ بھی واضح رہے کہ یہ پانچوں باتیں آپس میں ہم مرتبہ نہیں ہیں بلکہ ان پانچوں کے باہمی درجات میں تفاوت ہے مثلاً اگر دین اور جان میں سے کسی ایک کو بچانے کا موقع ہو تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس موقع پر دین بچانا مقدم ہوگا اگرچہ جان نہ بچ پائے، اسی طرح اگر جان اور مال میں سے ایک چیز بچائی جا سکتی ہو تو شریعت جان بچانے کو ترجیح دے گی وغیرہ ذلک۔

یہ پانچ ضروریات اصول دین میں سے ہیں، امام شاطبیؒ نے انہیں ''اصول دین، قواعد شریعت اور کلیات ملت'' کے القاب دیے ہیں جن سے ان کی اہمیت خود بخود واضح ہو رہی ہے، مثلاً قواعد ایمانیہ اور ارکان اسلامیہ کا مکلّف اس لیے بنایا گیا تاکہ انسان کا ''دین'' سلامت رہے، دیت، قصاص اور زخموں وغیرہ کے احکام اس لیے دیے گئے تاکہ انسانی ''نفس'' کی حفاظت ہو، نشہ آور چیزوں اور دیگر لہو ولعب کی ممانعت کی گئی تاکہ انسانی ''عقل'' سلامت رہے، گھریلو زندگی سے متعلق احکامات اس لیے دیئے گئے تاکہ انسانی ''نسل'' کو بقاء اور تحفظ میسر آئے، خرید وفروخت کے احکامات اور چوری وڈاکہ زنی وغیرہ کی ممانعت اس لئے کی گئی تاکہ انسانی ''مال'' محفوظ رہ سکے۔

اب دیکھ لیجئے کہ شریعت نے کس طرح اپنے احکامات میں ان پانچ باتوں کو ملحوظ رکھا ہے اسی لیے انہیں اصول دین اور قواعد شریعت کا لقب دیا گیا ہے، اور یہ بھی واضح رہے کہ جو باتیں ان پانچ مقاصد میں سے کسی میں بھی خلل انداز ہوں انہیں شریعت ''مفاسد'' کا نام دیتی

ہےاور جن باتوں سے یہ پانچ باتیں سلامت اور محفوظ رہیں انہیں ''مصالح'' قرار دیتی ہے۔

(۲)مصالح حاجیہ: یعنی وہ مصلحتیں جن سے انسانی حاجات وابستہ ہوں اور اگر وہ حاجات پوری نہ ہوں تو انسان تکلیف اور مشقت میں پڑ جائے، اِن انسانی حاجات سے متعلقہ احکامات میں شریعت نے جو اَہداف مقرر کیے ہیں انہیں ''مصالح حاجیہ'' کا نام دیا گیا ہے، مثلاً عذر کے وقت تیمّم کرنا وغیرہ پھر یہ مصالح حاجیہ اپنی اصل میں قسم اول مصالح ضروریہ سے ہی جڑی ہوئی ہیں مثلاً نکاح کے احکامات میں شریعت نے جو چیزیں مدنظر رکھی ہیں ان کا ایک ہدف نسل انسانی کی بقاء اور تحفظ ہے اور یہ بات اوپر بیان ہو چکی ہے کہ نسل انسانی کا تحفظ کلیات خمسہ اور مصالح ضروریہ میں سے ہے اسی طرح تجارت اور کرایہ داری وغیرہ کے احکامات کا ہدف مال کی حفاظت یا اس کی بڑھوتری ہے اور مال کی حفاظت بھی قسم اول مصالح ضروریہ میں سے ایک مصلحت ہے۔

ان انسانی حاجات میں شریعت نے عموماً رخصت اور آسانی کی ملحوظ رکھا ہے، چنانچہ بوقت ضرورت مردار کھانے کی اجازت اور پانی میسر نہ ہونے یا قدرت نہ ہونے کے وقت تیمّم کا حکم، سفر میں نماز کی قصر اور روزہ نہ رکھنے کی اجازت اسی سہولت اور رخصت پر مبنی ہے تا کہ انسان اپنی استطاعت کی حدود میں رہتے ہوئے دینی ارکان کو بجالا سکے اور انہیں محفوظ رکھ سکے۔

(۳)مصالح تحسینیہ: یعنی ایسی مصلحتیں اور ایسے اہداف جن کی رعایت انسانی کردار اور گفتار میں حسن وخوبی کا باعث ہوں، انہیں مصالح تحسینیہ کا نام دیا گیا ہے اور تمام اچھی عادات اور اچھے اخلاق اسی سے جڑے ہوتے ہیں، پھر تمام برے اخلاق سے اجتناب برتنا بھی اسی قسم سے متعلق ہے کیوں کہ بری باتوں اور برے اخلاق سے کنارہ کشی خود بخود انسان میں ایک حسن پیدا کر دیتی ہے، چنانچہ اسراف اور بخل وغیرہ سے اجتناب کرنا، میاں بیوی کے انتخاب میں کفاءت کو ملحوظ رکھنا، کھانے پینے کے آداب، حسن معاشرت، ستر عورت، نجاست سے پاک رہنا وغیرہ سب اس کی مثالیں ہیں۔

جس طرح مصالح کی دوسری قسم یعنی مصالح حاجیہ اپنی انتہاء میں قسم اول مصالح ضروریہ کی طرف لوٹتی ہیں اسی طرح یہ تیسری قسم مصالح تحسینیہ بھی انجام کار مصالح ضروریہ کی طرف ہی لوٹتی ہیں۔ مثلاً طہارت اور ستر عورت کا حکم ''حفظِ دین'' کی طرف لوٹتا ہے، کھانے پینے کے آداب اور حرام چیزوں سے اجتناب ''حفظِ نفس'' کی طرف لوٹتا ہے، میاں بیوی کا صحیح انتخاب اور حسن معاشرت ''حفظ نسل'' کی طرف لوٹتے ہیں، حلال کمانا، صحیح خرچ کرنا اور فقیروں کو اپنے مال میں سے حصہ دینا ''حفظ مال'' کی مصلحت کی طرف لوٹتے ہیں۔

یہ ایک نمونہ ہے اس بات کا کہ مصالح کی دوسری دونوں قسمیں اپنی انتہاء اور انجام کار میں قسم اول کی طرف ہی لوٹتے ہیں اسی لیے علمائے کرام نے قسم اول کو ''اصول دین اور قواعد شریعت'' کا نام دیا ہے۔

مقاصدِ شریعت کا سرچشمہ ومصدر اور اس علم کے فوائد

مقاصد شریعت کی تینوں قسمیں جو اوپر مذکور ہیں ان کا سرچشمہ اور منبع قرآن کریم اور سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اس

فرق کے ساتھ کہ قرآن کریم نے ان باتوں کو اصولی انداز میں بیان کیا ہے اور سنت نبویہ میں یہ چیزیں اپنی فروعات اور کافی تفصیلات کے ساتھ سے بیان ہوئی ہیں (۸) اس علم وفن کی معرفت اور اس میں رسوخ وکمال حاصل کرنے کے بہت سے فوائد ہیں، اُن میں سے تین درج ذیل ہیں:

☆ اس علم وفن کی معرفت سے احکام شریعت کی صحیح سمجھ بوجھ حاصل ہوتی ہے، چنانچہ امام جوینی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

من لم یتفطن لوقوع المقاصد فی الاوامر و النواهی فلیس علی بصیرة فی وضع الشریعة و هی قبلة المجتهدین ،من توجه الیها من ای جهة اصاب الحق دائما(۹)

جو شخص شرعی مامورات اور منہیات کے مقاصد نہ سمجھ سکے تو شرعی احکامات میں صاحب بصیرت نہیں بن سکتا، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مقاصد شریعت مجتہدین کی کاوشوں کا قبلہ ہیں اور جو شخص بھی کسی بھی مسئلے میں ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ حق پا کر ہی رہتا ہے۔

☆ قرآن کریم اور سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم ومعارف میں باریکی اور گہرائی نصیب ہوتی ہے۔

☆ وہ نت نئے مسائل اور حوادث جن کے بارے میں کوئی شرعی حکم منصوص نہیں ہوتا، اُن کے صحیح شرعی حکم تک رسائی حاصل کرنے میں یہ علم وفن خاص طور سے مددگار رہتا ہے۔

☆ اس علم وفن کا ماہر شرعی احکامات کو لوگوں کے سامنے آسان اور عام فہم بنا کر پیش کرتا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

یُرِیْدُ اللّٰهَ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَایُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ(۱۰)

اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں اور تمہیں مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

یَسِّرُوْا وَ لَاتُعَسِّرُوْا وَ بَشِّرُوْا وَ لَاتُنَفِّرُوْا (۱۱)

تم آسانی کرو، مشکلات کھڑی نہ کرو اور خوش خبری سناؤ، متنفر نہ کرو۔

اس علم کے فوائد پر گفتگو کرتے ہوئے ہمارے روحانی مربی ومحسن مسند الہند، ملاء اعلیٰ میں ابو الفیض کا لقب پانے والے حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تین نکات بھی ملاحظہ فرمالیں:

(۱) یہ فن قاری کو دین وشریعت میں بابصیرت بناتا ہے، جس طرح فن عروض کا ماہر شعراء کے کلام کو، علم منطق کا ماہر حکماء کے دلائل وبراہین کو، علم نحو کا ماہر فصحائے عرب کے کلام کو، اور اصول فقہ کا ماہر جزئیات فقہیہ کو بصیرت کے ساتھ سمجھ سکتا ہے، اسی طرح حکمت شرعیہ کا ماہر پورے دین کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ سکتا ہے۔

(۲) اس علم وفن سے واقف شخص علمی لغزشوں سے اور اندھا دھند قیاس آرائیوں سے محفوظ رہتا ہے، وہ رات میں سوختہ چننے والے کی طرح نہیں ہوتا کہ بھلے بُرے کی تمیز نہ کر سکے، اور وہ نالے کے پانی میں موتیوں کی تلاش میں غوطہ لگانے والے کی طرح بھی نہیں ہوتا کہ کوڑا کرکٹ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے اور ساری محنت رائیگاں جائے۔ نالے میں موتی کہاں رکھے ہیں؟ وہ تو ندی اونٹنی کی طرح ٹامک ٹوئیاں بھی نہیں مارتا، نہ وہ اندھی اونٹنی کی پیٹھ پر سواری کرنے والے کی طرح ہوتا ہے، نہ وہ اس کمپاؤنڈر کی طرح ہوتا ہے جس نے کسی ڈاکٹر کو دیکھا کہ وہ کسی کو سیب کھانے کا مشورہ دے رہا ہے تو اس نے ایسے ہی دوسرے مریض کو انڈرائن کھانے کا مشورہ دیدیا کیوں کہ سیب اور انڈرائن ہم شکل ہوتے ہیں، بلکہ اس علم کا ماہر دین کے بارے میں جو بھی بات کہتا ہے پوری بصیرت کے ساتھ کہتا ہے۔

(۳) اس علم کی معرفت سے دین وشریعت پر ایمان ویقین بڑھ جاتا ہے۔ جیسے کسی کو مخبر صادق نے بتایا کہ زہر جان لیوا ہے، اس نے یہ بات مان لی اور پھر فن طب کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زہر میں گرمی اور خشکی انتہاء درجے کی ہیں جو انسان کے مزاج کے بالکل منافی ہیں چنانچہ یہ بات جان کر اس شخص کا مخبر صادق کی بات پر پہلے سے موجود یقین مزید پختہ ہو گیا (۱۲)

مقاصدِ شریعت کی ایک دوسری تقسیم

شرعی احکام میں جو مقاصد اور اَہداف وغایات ملحوظ ہوتی ہیں، اُن کی خود اَحکام کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں: (۱) مقاصد عامہ (۲) مقاصد خاصہ (۳) مقاصد جزئیہ..... ان کی کچھ وضاحت یوں ہے۔

مقاصد عامہ: اس سے مراد وہ مقاصد ہیں جنہیں شریعت تمام احکامات میں یا اکثر احکامات میں ملحوظ رکھتی ہے، مثلاً الاعمال بالنیات اعمال کا دارومدار نیت پر ہے یہ ایسا شرعی مقصد ہے جو عموماً شرعی احکامات میں ملحوظ ہوتا ہے، اسی طرح یہ ضابطہ کہ الضرورات تبیح المحذورات ضرورت، ممنوع چیز کو مباح بنا دیتی ہے، یہ ضابطہ بھی اکثر شرعی احکامات میں بوقت ضرورت جاری ہوتا ہے۔ یہ دو مثالیں ہیں اُن مقاصد کی جو عموماً تمام یا کم از کم اکثر شرعی احکامات میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔

مقاصد خاصہ: اس سے مراد وہ اَہداف وغایات ہیں جنہیں شریعت خاص خاص اَبواب میں ملحوظ رکھتی ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ، جہاد فی سبیل اللہ، عقوبات، دیات، معاملات وغیرہ وغیرہ، تیونس کے مشہور عالم دین شیخ الاسلام طاہر ابن عاشور قدس اللہ سرہ نے ان مقاصد خاصہ کی درج ذیل تقسیم کی ہے۔

☆ گھریلو احکامات سے متعلق مقاصد شرعیہ

☆ اَموال سے متعلق شرعی مقاصد

☆ انسان اور انسانی بدن سے صادر ہونے والے اعمال سے متعلق مقاصد شرعیہ

☆ قضاء اور شہادت (گواہی) سے متعلق شرعی مقاصد

☆ تبرع، ہدایا اور اِحسانات سے متعلق مقاصد

☆ عقوبات سے متعلق مقاصد

مقاصد جزئیہ: اس سے مراد وہ شرعی مقاصد ہیں جنہیں شارع کی طرف سے ہر حکم شرعی میں ملحوظ رکھا گیا ہو، مثلاً کسی چیز کا واجب ہونا، کسی کا حرام ہونا، کسی کا مندوب ہونا، کسی کا مکروہ ہونا، کوئی چیز کسی حکم کے لیے شرط ہو اور کوئی چیز کسی حکم کے لیے سبب ہو وغیرہ وغیرہ، اس تیسری قسم سے عام طور سے فقہائے کرام بحث کرتے ہیں کیوں کہ وہی حضرات شرعی جزئیات اور دقائق کو حل کرنے میں متخصص ہوتے ہیں، البتہ اُن کے ہاں ان مقاصد کے لیے اصطلاحی نام مختلف ہوتے ہیں چنانچہ وہ کسی مقصد کو علت سے، کسی کو حکمت سے اور کسی سبب اور شرط وغیرہ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ امام عزالدین بن عبدالسلام قدس سرہ فرماتے ہیں:

من تتبع مقاصد الشرع فی جلب المصالح و درء المفاسد حصل له من مجموع ذلك اعتقاد او عرفان بان هذه المصلحة لا يجوز اهمالها و ان هذه المفسدة لا يجوز قربانها و ان لم يكن فيها اجماع و لا نص و لا قياس خاص (۱۳)

جو شخص بھی منافع کی تحصیل اور مفاسد کے دفعیہ میں شرعی مقاصد کو تہہ تک پہنچے گا تو اسے کامل یقین یا کم از کم قابل اطمینان معرفت اس بات کی حاصل ہو جائے گی کہ اُن مصالح کو بے کار چھوڑ دینا جائز ہے اور نہ ہی اُن مفاسد کے قریب جانا جائز ہے، اگرچہ اس سلسلے میں نہ تو کوئی اجماع ہو، نہ ہی کوئی نص ہو اور نہ ہی کوئی خاص قیاس ہو۔

علم المقاصد کی تاریخ وتدوین

ہر دینی علم وفن کی طرح یہ علم وفن بھی قرآن وسنت کے ضمن میں بکثرت موجود تھا، لیکن اسے باقاعدہ علمی حیثیت کافی مدت بعد حاصل ہوئی، اور اس کے اصول وقواعد کی تدوین وترتیب مدت بعد ہوئی، اس علم وفن کی تاریخی حیثیت کو ہم چار اَدوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا دور: قرآن وسنت کے نزول کے دور ہے، جس میں شرعی احکام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہے تھے اور بہت سے احکامات کی تفصیل وتبیین خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سنت کے ذریعہ فرما رہے تھے، یہ دور اس علم وفن کا بالکل ابتدائی اور تولیدی دور کہلا سکتا ہے، گویا اس دور میں یہ علم وفن وجود پذیر ہو رہا تھا، اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم سے کچھ مثالیں پیش کر دی جائیں، چنانچہ روزوں کی فرضیت کے بیان میں اس کی حکمت وغایت اور مقصد وہدف بھی واضح کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبلِكُم لَعَلَّكُم تَتَّقُونَ (۱۴)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے والوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تمہیں تقویٰ حاصل ہو۔

اس آیت سے واضح ہے کہ روزے کا حکم ''محض آرڈر'' نہیں بلکہ ''حکیمانہ آرڈر'' ہے، یعنی ایسا حکم ہے جس کی حکمت بھی ساتھ بیان کی گئی ہے اور یہی حکمت اس شرعی حکم کا مقصد کہلا رہی ہے۔

اسی طرح نماز کے بیان میں بھی اس کے مقاصد کو واضح کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنهَى عَنِ الفَحشَاءِ وَالمُنكَرِ (۱۵)

بے شک نماز فحاشی اور برائی سے سے روکتی ہے

معلوم ہوا کہ نماز کا ایک مقصد اور ہدف فحاشی سے اور برائی سے باز رکھنا ہے، چنانچہ جس نماز سے یہ مقصد حاصل ہوگا وہ اس نماز کے کمال کی دلیل ہے اور جہاں یہ مقصد حاصل نہ ہو رہا ہو تو گویا نماز کا وجود اور ڈھانچہ تو وہاں موجود ہے لیکن روح سے خالی ہے، اسی طرح جہاد کی اجازت دیتے ہوئے قرآن کریم نے اس کے سبب اور مقصد کو بھی بتلایا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُم ظُلِمُوا (۱۶)

جن کے ساتھ مشرکین نے لڑائی کی ہے اب انہیں بھی لڑائی کی اجازت دی جا رہی ہے کیوں کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے

وَقَاتِلُوهُم حَتَّى لَا تَكُونَ فِتنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّه (۱۷)

جب تک فتنہ ختم نہ ہو اور دین اللہ تعالیٰ کے لیے نہ ہو جائے تب تک ان مشرکوں سے لڑتے رہو

ان دو آیات میں جہاد کے سبب اور غرض وغایت کا صاف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے اور یہی اسباب واہداف شرعی احکامات کے مقاصد کہلاتے ہیں، طالب علم پر یہ بات بھی واضح ہو رہی ہوگی کہ ان مثالوں میں مقاصد شریعت کا بیان تو موجود ہے لیکن اس کے باقاعدہ اصول وضوابط موجود نہیں جیسا کہ عام طور سے اہل علم کسی بھی علم کو مدون کرتے وقت اس کے لیے قواعد وضوابط بیان کرتے ہیں۔ اس لیے ہم نے کہا کہ اس علم وفن کی بنیاد تو قرآن وسنت میں ہی ہے لیکن اس کی باقاعدہ تدوین بہت بعد میں ہوئی، یہ پہلا دور تو صرف اس علم وفن کے وجود کی ابتداء کا دور ہے۔

دوسرا دور: نت نئے مسائل وحوادث کے شرعی احکامات کی تخریج کے لیے اہل علم نے جب فقہ کے ساتھ ساتھ اصول فقہ بھی مدون کرنا شروع کیے تو اصول فقہ ہی کے ضمن میں مقاصد شریعت کو بیان کیا جانے لگا، اس دور میں مقاصد شریعت کے کچھ قواعد وضوابط مقرر تو ہوئے لیکن وہ مستقلاً نہیں تھے بلکہ اصول فقہ ہی کے قواعد وضوابط شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ ''علت، حکمت، سبب، شرط'' وغیرہ کی مباحث جو اصول فقہ کی اہم مباحث میں شمار ہوتی ہیں یہی مباحث مقاصد شریعت سے بھی بہت گہرا ربط وتعلق رکھتی ہیں۔

تیسرا دور: جب علمائے کرام نے اصول فقہ کے ذیل میں اس علم وفن کو ایک مستقل بحث کی شکل دی یا اصول فقہ سے الگ کر کے اسے

باقاعدہ علم وفن کی شکل میں پیش کیا، یہ دور تقریباً امام الحرمین ابو المعالی الجوینی (متوفی ۴۷۸ھ) سے شروع ہوتا ہے جنہوں نے اپنی کتاب البرھان فی اصول الفقہ میں مستقل اس بحث کو جگہ دی اور عنوان قائم کیا کتاب فی تقسیم العلل و الاصول التی بھا تظھر المقاصد و یکشف عن المصالح اُن علل اور اصولوں کی تقسیم کا بیان جن کے ذریعے مقاصد شریعت ظاہر ہوتے ہیں اور مصالح شرعیہ سے پردہ اٹھتا ہے شاید ایسے ہی منفرد مباحث کی وجہ سے امام تاج الدین عبدالوہاب بن علی بن عبدالکافی السبکی الشافعی (متوفی ۷۷۱ھ) نے اس کتاب بارے یہ شاندار تبصرہ کیا ہے کہ

وضع امام الحرمین فی اصول الفقہ کتاب البرھان علی اسلوب غریب لم یقتد فیہ باحد(۱۸)

امام الحرمین نے اصول فقہ میں ایسی کتاب تحریر ہے جو بالکل ہی منفرد ہے اور اس میں انہوں نے کسی کی بھی تقلید نہیں کی (یعنی مباحث کی جدت اور اسلوب کی ندرت ایسی ہے جو ان سے پہلے کی لکھی ہوئی اس موضوع کی کتابوں میں نہیں ملتیں)

ان کے بعد ان کے شاگرد امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) کا دور آتا ہے اور انہوں نے بھی اپنے کمال علمی سے اس علم وفن کی تدوین اور ترویج میں مثالی حصہ لیا، چنانچہ ان کی کتابوں میں شفاء الغلیل ،المنخول اور المستصفی میں اس موضوع کی مباحث جا بجا بکھری ہوئی ہیں اور بلاشبہ وہ بہت ہی عمدہ مباحث ہیں، پھر ایک عرصے بعد جلیل القدر عالم شیخ عزالدین بن عبدالسلام (متوفی ۶۶۰ھ) کا دور آتا ہے اور انہوں نے اس علم وفن کو گویا بالکل ہی نئی زندگی بخش دی اور ان کی تالیفات سے یہ علم وفن علماء کے حلقوں میں خوب گردش کرنے لگا، چنانچہ ان کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام گویا اس علم وفن کی ابتدائی مستقل کتابوں میں شمار کی جانے لگی بعد ازاں ان کے شاگرد امام شہاب الدین قرافی (متوفی ۶۸۵ھ) نے اپنے شیخ کی پیروی کرتے ہوئے اس علم وفن کے قواعد وضوابط کی تحریر وترتیب پر توجہ مبذول رکھی، چنانچہ ان کی اکثر کتابوں میں اس موضوع کی جھلک موجود ہوتی ہے مگر خصوصاً الفروق میں تو یہ علم وفن پوری شان سے جھلک رہا ہے

اسی طرح اپنے وقت میں جلیل القدر امام شیخ الاسلام ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) جو ہر علم وفن میں مثالی مہارت رکھتے تھے، انہوں نے بھی اپنی تحریرات میں اس علم وفن کی مباحث کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اگرچہ وہ سب مباحث ان کی تالیفات میں بکھری ہوئی ہیں لیکن بہرحال ان کی تحریرات میں اس علم کا استعمال خوب ہوا ہے، یہی حال ان کے شاگرد امام ابن قیم (متوفی ۷۵۱ھ) کا ہے، انہوں نے بھی اپنے استاذ سے اس علم وفن کی مباحث کو حاصل کرنے کے بعد اسے خوب نکھارا ہے، خصوصا ان کی کتاب اِعـــــــلام المؤقّعین عن رب العالمین اس علم کی مباحث سے لبریز ہے، چنانچہ اس میں صاف صاف تحریر فرماتے ہیں:

الشریعۃ مبناھا و اساسھا علی الحکم و مصالح العباد فی المعاش و المعاد وھی عدل کلھا و رحمۃ کلھا و مصالح کلھا و حکمۃ کلھا فکل مسئلۃ خرجت عن العدل الی الجور و عن الرحمۃ الی ضدھا و عن المصلحۃ الی المفسدۃ و عن الحکمۃ الی العبث فلیس من الشریعۃ و ان ادخلت فیھا بالتاویل ۔

شریعت کی اساس اور بنیاد حکمتوں اور بندے کی دنیاوی اور اخروی مصلحتوں پر قائم ہے، چنانچہ اسلامی شریعت سراپا عدل

ورحمت اور حکمتوں و مصلحتوں سے لبریز ہے، اسی لیے ہر وہ مسئلہ جو عدل کے بجائے ظلم، رحمت کے بجائے غضب، مصلحت کے بجائے فساد اور حکمت کے بجائے فضولیات کی طرف لے جانے والا ہو وہ شرعی حکم نہیں ہوسکتا، اگرچہ اسے تاویل سے شریعت میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ان سب کے بعد آٹھویں صدی ہجری میں امام شاطبی (متوفی ۷۹۰ھ) آتے ہیں اور اپنے خداداد کمال علمی سے اس علم وفن کو باقاعدہ منضبط کرکے اس علم وفن کے ''شیخ'' قرار پاتے ہیں، اس موضوع پر ان کی مستقل کتاب الموافقات فی اصول الشریعة میں اسی علم وفن کے مبادی ومباحث کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے حتی کہ مزید توضیح کے لیے اس کتاب میں کتاب المقاصد کے عنوان سے باقاعدہ ایک الگ بحث شامل کی ہے، چنانچہ شیخ الاسلام امام طاہر ابن عاشور مالکی تیونسی (متوفی ۱۳۹۳ھ) ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں

و الرجل الفذ الذی افرد هذا الفن بالتدوین هو ابو اسحاق ابراهیم بن موسی الشاطبی المالکی(۱۹)

وہ باکمال انسان جس نے اس علم کو مدون کرکے مستقل شکل دی امام ابواسحاق ابراہیم بن موسی شاطبی مالکی ہیں۔

چوتھا دور: یہ عصر حاضر اور اس سے کچھ ہی ماضی قریب کا دور ہے، اس دور میں یہ علم وفن دوبارہ زندہ ہوا اور مشرق ومغرب کے متعدد اہل علم نے اس علم کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا، جن میں عبداللہ دراز مصری خاص طور سے شمار ہیں جنہوں نے امام شاطبی کی الموافقات کو اپنی تحقیق وتعلیق کے ساتھ شائع کرکے اہل علم پر بڑا احسان کیا، اسی طرح علمائے مغرب میں سے مالکی شیخ الاسلام تیونسی عالم دین شیخ طاہر ابن عاشور اور شیخ علال الفاسی نے اس علم کے احیاء وترویج میں بنیادی وابتدائی حصہ ڈالا، چنانچہ اس وقت اہل اسلام میں بہت سے اہل علم اس علم کی خدمت میں مشغول ہیں اور روز بروز اس علم کی طرف توجہ اور ضرورت بڑھتی ہی جارہی ہے۔

شاہ ولی اللہ، حجة الله البالغة اور علمائے دیوبند

مقاصد شریعت پر عبور رکھنے والے علماء میں ہمارے ہندوستانی عالم دین مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا نام شامل کیے بغیر شاید اس علم کی تاریخ مکمل ہی نہ ہوسکے، آپ کی مایہ ناز کتاب حجة الله البالغة نے اس علم کو بہت سے نئی جہات عطاء کیں اور اس اخیر دور میں عرب وعجم کے متعدد علمائے کرام نے اس علم وفن کی سمجھنے اور اس میں رسوخ وکمال حاصل کرنے کے لیے اس کتاب سے ہی بنیادی رہنمائی لی ہے اور محققین کا کہنا یہ ہے کہ یہ کتاب اس موضوع پر لکھی جانے والی متقدمین کی تمام کتابوں سے فائق اور مفید تر ہے۔

چنانچہ ہمارے ہاں ہندوستان میں شاہ صاحب کے بعد ان کے علمی جانشین حلقوں میں علمائے دیوبند نے اس کتاب پر توجہ مبذول رکھی اور حجة الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے اپنی تحریرات میں اس علم وفن سے بے حد نفع اٹھایا اور اس علم کی مباحث کو معقولات کے دائرے سے نکال محسوسات کے دائرے میں داخل کردیا۔

الغرض حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد علمائے دیوبند میں اس علم وفن کے ماہرین میں چار شخصیات کا نام بالکل نمایاں ہے اور ان کی تحریرات پڑھنے سے علم ومعرفت کے نئے در وا ہوتے ہیں:

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ)

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی (متوفی ۱۳۶۹ھ)

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ)

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی (متوفی ۱۴۰۳ھ)

اس کے علاوہ دار العلوم دیوبند کے موجودہ شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم العالیہ کے قلم کا عظیم شاہکار حجۃ اللہ البالغۃ کی بے مثال اردو شرح رحمۃ اللہ الواسعہ کا مطالعہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مفید ہے مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ کم از کم ایک سال کا دورانیہ مختص کر کے اس کتاب کا نہایت دلجمعی اور استیعاب کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

علم المقاصد کی چند اہم کتابیں

بات کو مزید آگے بڑھانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس موضوع کی چند اہم ترین اور متداول کتابوں کا تذکرہ کر دیا جائے:

- ☆ قواعد الاحکام فی مصالح الانام: للشیخ عزالدین بن عبد السلام الدمشقیؒ
- ☆ الموافقات فی اصول ا لشریعۃ: للامام ابی اسحاق ابراھیم الشاطبیؒ
- ☆ مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ: للشیخ الامام محمد الطاھر ابن عاشور المالکی التیونسیؒ
- ☆ حجۃ اللّٰہ البالغۃ: للامام الشاہ ولی اللّٰہ المحدث الدھلویؒ
- ☆ مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ ومکارمھا: للشیخ علّال الفاسی المغربی
- ☆ ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ: للشیخ محمد سعید رمضان البوطی
- ☆ نظریۃ المقاصد عند الامام الشاطبی: للشیخ احمد الریسونی
- ☆ نظریۃ المصلحۃ فی الفقہ ا لاسلامی: للشیخ حسین حامد حسان
- ☆ المقاصد العامۃ للشریعۃ الاسلامیۃ: للدکتور یوسف العالم
- ☆ نظریۃ المقاصد عند الامام محمد الطاھر ابن عاشور: للدکتور اسماعیل حسنی
- ☆ الشاطبی و مقاصد الشریعۃ: للحمادی العُبیدی
- ☆ المقاصد و علاقتھا بالادلۃ الشرعیۃ: للشیخ محمد سعد الیوبی
- ☆ المختصر الوجیز فی مقاصد الشریعۃ : للشیخ عوض بن محمد القرنی

مقاصد شریعت کی مباحث کہاں کہاں موجود ہوتی ہیں یا ہوسکتی ہیں؟

یہ بات پہلے عرض کی تھی کہ متقدمین اہل علم کے ہاں مقاصد شریعت کی مباحث عموماً اصول فقہ کے ضمن میں بیان ہوتی تھیں اوراب بھی اصول فقہ میں ان مباحث کومختلف مقامات پر بیان کیا جاتا ہے، چنانچہ شیخ نورالدین الخادمی کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل وہ مقامات ہیں جہاں مقاصد شریعت کی مباحث موجود ہوتی ہیں یا اہل علم ان مباحث کو وہاں درج کرسکتے ہیں:

☆ مباحث القیاس☆مباحث الاستحسان☆مباحث المصلحة المرسلة☆ مباحث العرف☆مباحث الذرائع سداً وفتحاً☆ مباحث الأحكام الشرعية (العلل، الحسن والقبح، وشروط التكليف)☆ مباحث القواعد الشرعية ☆مباحث السياسة الشرعية☆مباحث نصوص الأحكام .(آيات وأحاديث الأحكام) ☆ مباحث التعارض والترجيح بالمقصد ☆ مباحث الخلاف الفقهي☆ مباحث مفاهيم الموافقة والمخالفة☆ مباحث الدراسات الإسلامية المعاصرة، والتي تتعلق أساساً بإبراز الأهداف والخصائص والقيم الإسلامي العامة☆ مباحث الدراسات الشرعية والقانونية والفكرية ذات الصلة بالمقاصد والمصالح الشرعية.

فائدہ ضروریہ

یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ عموماً علمائے مقاصد شریعت کے ہاں حکمت، علت اور مصلحت کے الفاظ ہم معنی ہوتے ہیں، اگرچہ علمائے اصول فقہ ان میں فرق کرتے ہیں۔

مضمون کے مصادر

مقاله: تعريف مقاصد الشريعة للشيخ نور الدين الخادمي

مقاله: معنى مقاصد الشريعة و فوائد معرفتها لابى الحسن هشام المحجوبى

كتاب: الشاطبى و مقاصدالشريعة للحمادى العبيدى

مصادر ومراجع

(١)حجة الله البالغة بعد ازخطبه(٢)ايضاً(٣)النحل:٩(٤)لقمان:١٩(٥) بخارى، كتاب الرقاق(٦)الاجتهاد المقاصدى حجيته ، ضوابطه، مجالاته ج١ص٥٢(٧)النحل:٣٦(٨)الشاطبى ومقاصد الشريعة للحمادى العبيدى،ص ١٢٣(٩) البرهان فى اصول الفقه: ج١، ص٢٠٦ (١٠)البقرة:١٨٥(١١) البخارى،ح٦٩(١٢)رحمة الله الواسعة شرح حجة الله البالغه، ج١ ،ص٧٥،٧٦ بتغير يسير(١٣)قواعد الاحكام، ج٢، ص١٢٠(١٤)البقرة:١٨٣(١٥)العنكبوت:٤٥(١٦)الحج: ٣٩(١٧)البقرة : ١٩٣(١٨)طبقات الشافعية للسبكى ج٥،ص١٩٢(١٩)مقاصد الشريعة الاسلامية لابن عاشور

مولانا سید حبیب اللہ شاہ حقانی
مدرس جامعہ عثمانیہ ملاوی افریقہ

ہم نے دیکھا تھا اک فنافی اللہ
شیخ الحدیث حضرت مولانا مطلع الانوار صاحبؒ

نمونہ اسلاف، محدث کبیر، شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تلمیذ خاص شیخ الحدیث مولانا مطلع الانوار قدس سرہ شیخ الحدیث جامعہ ہدایت الاسلام پشاور کے سانحہ ارتحال پر ان کے شاگرد رشید مولانا سید حبیب اللہ حقانی (مدرس جامعہ عثمانیہ افریقہ) کا خصوصی سوانحی مضمون افادہ عامہ کی خاطر نذر قارئین ہیں۔ (ادارہ)

خلاق عالم نے کرہ ارضی پر کچھ ایسی شخصیات پیدا کی ہے، جن کا طرہ امتیاز ہی ان کی گمنامی ہوا کرتی ہے، زمانہ میں ان کی خدمات، ان کی علوم ومعارف اوران کی فیضان کا ڈنکا بجتا ہے، لیکن اہل زمانہ ان کی شخصیت سے یکسر ناواقف ہوتے ہیں، اس کی وجہ ایسے لوگوں کی فناء فی اللہ، ترک دنیا، زہد فی الدنیا اور رغبت اخروی ہوتی ہے،، اس فانی دنیا میں انسانوں کے پردہ سماعت سے اموات کے نہ جانے کتنے اعلانات اور خبریں ٹکراتی ہیں، اور ٹکرائیں گے، ہر نکھرتی ہوئے صبح اور ہر ڈھلتی ہوئے شام کسی نہ کسی شخص کیلئے منتہائے زیست کا پیغام لاتی ہے، پھر اس شخص کو دارالفنا سے دارالبقا کی جانب کوچ کر جانا ہوتا ہے، موت سے کس کو دستگاری ہے!

آج وہ کل ہماری باری ہے، لیکن کچھ ہستیاں اور شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جنکی موت کی خبر سنتے ہی ہر آنکھ برسنے لگتی ہے، گرد وپیش کے احوال سوگوار نظر آنے لگتی ہیں، قلب کو ایک دھچکا اور وجود میں لرزہ طاری ہونے لگتا ہے، حواس معطل اور ہوش ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے، چمن میں فضائے ماتمی اور سر پر یتیمی کا سایہ منڈلانے لگتا ہے، انہیں نابغہ روزگار، یکتائے زمانہ شخصیات میں سے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کے تلمیذ رشید، محدث جلیل، خادم حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور احقر کے محسن وشفیق استاد حضرت مولانا شیخ الحدیث مولانا مطلع الانور قدس سرہ کی شخصیت بھی تھی، جنہیں کل تک طول عمری، اور وسعت فیضان کی دعا دی جاتی تھی، آج رحمت ومغفرت کیسابقہ لاحقہ سے یاد کیا جارہا ہے، ۲۱ نومبر بروز پیر آخر کار استاد گرامی قدر اس دار فانی سے رحلت فرما گئے, انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مختصر تعارف

حضرت شیخ کا تعلق صوبہ خیبر پختونخوا کے مردخیز ضلع چارسدہ کے علمی گھرانہ سے تھا، آپ کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالواحدؒ المعروف بہ صاحب حق صاحب کوٹ بھی ممتاز عالم دین تھے، حضرت شیخ ۱۳۳۷ھ بمطابق ۱۹۱۹ء کوٹ میں پیدا ہوئے، چارسال کی عمر میں اپنی پھوپھی صاحبہ سے جو عالمہ فاضلہ تھیں سے قاعدہ بغدادی شروع کرائی، قران مجید کا ختم انہی کے ساتھ کیا، پنج گنج، تحفہ نصائح، گلستان بوستان وغیرہ کی کتب انہی سے پڑھیں، نحومیر تا شرح جامی، منطق وغیرہ کی کتابیں اپنے چچا حضرت مولانا فضل مولیٰ (فاضل دیوبند) سے پڑھیں، سلم، ملاجلال، حمداللہ اور معانی کی کتابیں اپنے دوسرے چچا حضرت مولانا عبدالوہاب (فاضل مدرسہ عالیہ راجپور ہندوستان) سے پڑھیں، ۱۳۵۹ھ میں سفر کا آغاز فرمایا اور دیر گئے اور علمی پیاس بجھایا، اٹک دامان میں مولانا محمد عمر، مولانا عبدالدیان سے بھی کسب فیض کیا ۱۳۶۳ھ میں اپنے پھوپھی زاد مولانا عنایت احمد کے ہمراہ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں کے مشائخ اور اکابر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، دیوبند میں حضرت مولانا نور محمدؒ سے حسامی، حضرت مولانا حبیب اللہ سے توضیح تلویح، قاضی مبارک، حضرت مولانا عبدالخالق ملتانیؒ سے صدرا، شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ (بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) سے جلالین، الفوز الکبیر، حضرت مولانا محمد شریف کشمیریؒ سے مشکوۃ شریف، مولانا بشیر احمد خان گھلاویؒ سے شرح چغمینیؒ، سبع شداد، مفتی سید احمدؒ سے سراجی، مولانا حکیم محمد عمر دیوبندیؒ سے قانونچہ، طب اور قراءت کی مشق مولانا قاری احمد میاں بن شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ سے پڑھا، اور دورہ حدیث کے اسباق شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، (بخاری کامل، ترمذی اول) شیخ الحدیث حضرت مولانا اعزاز علیؒ (ابوداؤد وشمائل) مولانا ابراہیم بلیاویؒ سے مسلم شریف مولانا فخر الدینؒ سے نسائی، ابن ماجہ، مولانا عبدالحق ملتانیؒ سے مؤطا اور دارالعلوم کے نائب مہتمم مولانا مبارک علیؒ سے طحاوی پڑھیں، فراغت کا سال ۱۹۴۸ء ہے۔

حضرت شیخ ۱۹۴۷ء کے چھٹیوں میں گاؤں نہیں آئے تھے اور وہیں دارالعلوم دیوبند ہی میں رہے، رمضان میں پاکستان بنا اور آنے جانے کے راستے مسدود ہوئے تو حضرت شیخ ۱۹۴۷ء سے اپریل ۱۹۴۹ء تک وہیں رہے اور گاؤں میں ان کی موت وحیات کا کسی کو کئی پتہ نہ تھا، (تفصیل احقر کے مضمون ''دیوبند سے واپسی) میں ملاحظہ ہو مطبوعہ الحق)

تدریسی زندگی

حضرت شیخ طالب علمی کے زمانہ میں مطول، جلالین، کشاف، مختصر المعانی، وغیرہ کتابیں طلبہ کو پڑھائیں، واپس تشریف لاکر پرانی ترتیب کے مطابق مسجد میں پڑھانا شروع کیا اور مختصر ومطول تک کتابیں پڑھائیں، دارالعلوم اسلامیہ چارسدہ کے قیام کے بعد ارباب اہتمام کی خواہش پر وہیں تشریف لائے اور ۳۵ روپے مشاہرہ مقرر ہوا، ۱۸ سال تک وہیں جم کر درس وتدریس میں مشغول رہے، دورہ حدیث کے اسباق مسلم وطحاوی سمیت تحتانی درجوں کی کتابیں پڑھائیں، اسی دوران اوکاڑہ پنجاب کے کے مدرسہ حنفیہ میں

بھی ایک سال گزرا، بعد ازاں دارالعلوم احناف میرزو میں اپنے پھوپھی زاد بھائی مولانا عنایت اللہؒ کے ہمراہ موقوف علیہ اور دورہ حدیث کے چھ سال تک اسباق پڑھائے، پھر دارالعلوم ہدایت الاسلام تخت آباد پشاور کے اراکین کے اصرار پر حضرات شیخین وہیں تشریف لائے اور دس سال پڑھانے کے بعد مدرسہ انوار محمد یہ بازار شہیدان مردان تشریف لائے اور ۱۲ سال تک اکیلے موقوف علیہ کے اسباق پڑھاتے رہے اسی دوران ہر سال تخت آباد والے دوبارہ لانے کی کوششوں میں لگے رہے یہاں تک کہ کامیاب ہوئے اور ۲۰۰۲ میں حضرت شیخ تخت آباد تشریف لائے اور تادم واپسیں وہیں پڑھاتے رہے۔

احقر کا حضرت شیخ سے تعلق وتلمذ

۲۰۰۶-۰۷ احقر کے موقوف علیہ کا سال تھا جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں داخلہ نہیں ملا تو حضرت الاستاذ مولانا عبدالقیوم حقانی مدظلہ کے حکم پر دارالعلوم سرحد اور بعد ازاں دارالعلوم ہدایت الاسلام تخت آباد پشاور کا رخ کیا، حضرت الاستاذ کا سفارشی خط ساتھ تھا، دفتر میں مولانا تحمید اللہ صاحب کو خط دیا، مہتمم جناب صاحب اور دیگر اساتذہ بھی تشریف فرما تھے فارم پر کر دیا تو مسئلہ رہائش کا تھا کیونکہ موقوف علیہ کے طلبہ کو گاؤں کے مساجد میں رہنا پڑتا، ہمیں بھی ایک دور مسجد کی نشاندہی کی گئی، جٹی بالا میں مسجد ملا، عصر کو مدرسہ آئے تو حضرت شیخ الحدیث مولانا مطلع الانوارؒ سے ملاقات ہوئی، یہ احقر کی حضرت شیخ سے پہلی ملاقات تھی، پہلی ملاقات میں دل کو ایسے بھائے کہ دل وہیں کا ہو کر رہ گیا، احقر کیساتھ مولانا محمد اسلام حقانی اور مولانا محمد زکریا بھی تھے، مسجد کے دور ہونے کی وجہ سے مولانا اسلام نے تو ہمت ہاری اور واپس دارالعلوم حقانیہ چلے گئے، جب کہ احقر نے عزم مصمم کیا تھا کہ جتنی بھی سختی برداشت کرنا پڑے حضرت شیخ کے قدموں میں رہنا ہے چند دن کے بعد قریب میں مسجد ملی، ہسپتال مسجد جس کے خطیب مولانا تحمید اللہ صاحب تھے، موقوف علیہ کے اسباق پورے کے پورے حضرت شیخ سے پڑھے، مکمل، بیضاوی شریف، مشکوۃ شریف مکمل، اور ہدایہ آخرین، شیخ صاحب سات بجے صبح تشریف لاتے اور بلا کسی وقفہ ۱۲ بجے تک پڑھاتے رہے طلبہ درمیان میں اٹھتے مگر حضرت شیخ کسی کو نہ روکتے نہ ڈانٹتے، البتہ امتحان کے دن ان کی خیر نہ ہوتی حضرت شیخ کا امتحان بہت سخت مشہور تھا، آپ خود ہی امتحان لیتے اور جو طلبہ سبق کی پابندی نہیں کرتے تھے انہیں کے ساتھ سختی سے پیش آتے اور فرماتے آپ تو گھومتے پھرتے مگر فیل کسی کو نہ فرماتے اور یہ امتحان کئی دن تک جاری رہتا ایک طالب علم سے گھنٹہ سے زیادہ وقت میں امتحان لیتے۔

حضرت شیخ کا طلبہ پر شفقت

حضرت شیخ طلبہ کے ساتھ بہت شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، احقر اکثر عصر کے بعد خدمت میں حاضر ہوتا تھا، حضرت الاستاذ مولانا حقانی مدظلہ کا سلام بھی پہنچاتا، ان کی طرف سے ہدایا کتب بھی، بہت خوش ہوتے اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازتے اور فرماتے حضرت مولانا حقانی صاحب صوبہ سرحد کے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہیں اور اکثر طلبہ سے فرماتے کہ لکھا کروں یہ لکھنا بہت قیمتی چیز ہے بعد میں کام آئے گی، دوران درس طلبہ کی تربیت کے حوالے سے اکابر دیوبند کے واقعات سناتے بالخصوص شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ذکر فرماتے تو پھر گھنٹوں تک حضرت شیخ الاسلامؒ کے حالات وواقعات سناتے، دارالعلوم دیوبند کے اکثر اساتذہ کا ذکر فرماتے مگر شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی سے حضرت شیخ کا والہانہ محبت تھا۔

دارالعلوم دیوبند سے انہیں محبت تھی اکثر فرماتے تھے میری خواہش ہے کہ یہاں سے طلبہ دیوبند جائے میں نے اس سلسلہ میں قائد جمعیت مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے بات بھی کی کہ وہ حکومت سے پرزور مطالبہ کرے کہ تعلیمی ویزے کی اجازت دے اور پاکستانی طلبہ پر دارالعلوم دیوبند کے دروازے کھلے، مولانا فضل الرحمٰن نے جواب میں فرمایا میں نے اپنے بیٹے اسعد محمود کے لیے بہت کوشش کی کہ دارالعلوم دیوبند بھیج دوں مگر اجازت نہ ملی تو میں نے خیر المدارس داخل کر دیا، فرماتے وہ ہمارے اکابر کی جگہ ہے وہاں صرف رہنا بھی خیر وبرکت سے خالی نہیں۔

دارالعلوم حقانیہ سے تعلق

حضرت شیخؒ کو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے قلبی محبت تھی موقوف علیہ سے فارغ ہونے والے طلبہ کو اکثر مشورہ دیتے کہ دارالعلوم حقانیہ میں داخلہ لو یہ ہمارے استاد شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کے اخلاص وللّٰہیت کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم روز افزوں ترقیوں پر ہے، دارالعلوم کے استحکام اور ترقی کے لیے اکثر دعا فرماتے۔

قیام دارالعلوم دیوبند کے دوران شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ سے اپنے رشتہ تلمذ کو بہت فخر کے ساتھ بیان فرماتے، فرماتے مولانا عبدالحقؒ سے میں نے جلالین پڑھی ہیں مولانا دارالعلوم دیوبند میں سرحد کے طلبہ کا مرجع ہوتے تھے، فرماتے دارالعلوم دیوبند میں دو مولانا عبدالحق تھے ایک مولانا عبدالحقؒ نافع اور ایک مولانا عبدالحق اکوڑویؒ، حضرت شیخ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مولنا عبدالحق کو مولانا عبدالحق انفع کہہ کر پکارتے، دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم ملکی سیاست میں قابل قدر شخصیت سیدی وسندی شیخ الحدیث مولانا سمیع الحق صاحب کا ذکر خیر بھی فرماتے احقر نے کئی دفعہ حضرت شیخ کو فرماتے سنا کہ مجھے مولانا سمیع الحق بہت اچھے لگتے ہیں دارالعلوم حقانیہ کو بہت احسن انداز سے چلا رہے ہیں اور طلبہ سے محبت کرتے ہیں۔

احقر نے حضرت شیخ صاحب کی خدمت میں کئی بار عرض کیا، کہ حضرت آپ دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے، شیخ الحدیث مولانا سمیع الحق صاحب سے بھی عرض کیا مگر حضرت شیخ ہنس کر فرماتے کیا کروں یہ تخت آباد والے مجھے نہیں چھوڑ رہے، بہت محبت کرنے والے لوگ ہیں طلبہ کی خدمت کرتے ہیں اس وجہ سے بغیر کسی وجہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہ رہا بلکہ ان لوگوں کی تو خواہش ہے کہ میں بعد از مرگ یہیں دفن ہوں، احقر عرض کرتا جی مولانا مدظلہ بھی طلبہ سے شدید قسم کے محبت فرماتے ہیں پھر چند واقعات سنائے تو حضرت شیخ بہت خوش ہوئے، فرماتے میں اب پڑھانے کے قابل بھی نہیں ہوں مگر یہ لوگ مجھے نہیں چھوڑ رہے کئی دفعہ کہا مگر کہتے ہیں نہیں، نہیں یہی رہنا ہے۔

جمعیت علماء اسلام سے تعلق

جمعیت (ف) اور (س) کے اختلافات ختم کرنے کے لیے بہت کوشش کی فرماتے میں چاہتا ہوں کہ دونوں ایک ہو جائے مولانا سمیع الحق مدظلہ کو سرپرست اعلیٰ مقرر کیا جائے اور مولانا فضل الرحمٰن امیر ہوں فرماتے میں نے مولانا فضل الرحمٰن سے بات کی وہ راضی بھی ہوئے مگر بعض شر پسند عناصر اس کو کامیاب نہیں کرائے دیتے۔

اے کاش! حضرت شیخ کی یہ خواہش پوری ہوتی کتنے اکابر اس ارمان کو دل میں لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے، فرماتے جمعیت میں اختلافات دیکھ کر میرا جی کڑھتا ہے، ہم نے جمعیت کے لیے قربانیاں دی ہیں میں قیام پاکستان سے قبل جمعیت کے ساتھ وابستہ ہوں، ہم وہیں (دیوبند) سے حضرت شیخ (مولانا حسین احمد مدنیؒ) کے بیانات اخبارات کے لیے پشاور بھجواتے، حضرت شیخ مدنیؒ بھی پٹھانوں سے اسی وجہ سے محبت فرماتے کہ یہ بہادر اور مہمان نواز ہیں۔

فرماتے افسوس! آج لوگ عہدے کے لالچ میں جماعت سے روٹھ جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو دین کی کوئی فکر نہیں، سیاست تو عبادت ہے، مولانا مفتی محمودؒ اور دیگر اکابرین جمعیت کا ذکر خیر فرماتے، مولانا فضل الرحمٰن مدظلہ سے تو عشق کے درجے تک محبت تھی، ایک مرتبہ احقر جمعہ کے دن ان کے گاؤں پہنچا تو حضرت شیخ ممبر پر تشریف فرما ہیں اور قائد جمعیت مولانا فضل الرحمٰن مدظلہ کی نئی تقریر موبائل سے جو مدارس کے تحفظ اور اسمبلی میں کیے گئے کوششوں کے حوالے سے تھی لاؤڈ سپیکر کے ذریعے عوام تک پہنچا رہے تھے، حالات حاضرہ سے باخبر ہونے کے لیے اخبار ضرور پڑھتے روزنامہ اسلام اور روزنامہ آئین اکثر ان کے سامنے رہتے، احقر کے کالمز کا سلسلہ کچھ عرصہ روزنامہ آئین پشاور میں چلا تھا، جب حاضر خدمت ہوتا تو حوصلہ افزائی ضرور فرماتے، ہائے! اب وہ شفقت بھری نگاہیں نہیں رہیں، حضرت شیخ سینکڑوں بلکہ ہزاروں تلامذہ کو سوگوار چھوڑ کر دنیا کو سدھار گئے، فرحمه الله رحمة واسعة

جو بادہ کش تھے پرانے اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی!

مولانا علی عمران
خادم دارالافتاء والاحسان اسلام آباد

تہذیب جدید کا چیلنج

بات یہ نہیں کہ دور گذشتہ میں اسلامی تہذیب کو کوئی چیلنج درپیش نہیں ہوا، لاریب کہ ہوا، ایک سے زیادہ مرتبہ ہوا، خود انہی صلیبیوں اور یہودیوں کے آباؤ اجداد کے ہاتھوں بھی اور تاتاریوں کے ہاتھوں بھی، وہ تاتاری دَل کہ زمین کا دِل جس سے لرزتا تھا اور جن کے اسپ تازی کی تگ وتاز شمال تا جنوب اور شرق تا غرب پھیلی ہوئی تھی، جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے افراد کیا دھرتی اور ملکوں کے دل کانپ اٹھتے تھے، جو بلا تیغ بھی فاتح ہوتے، جنکی مکاری نے دنیائے اسلام کے خوبصورت ترین شہروں کو خاک وخون کا ایک ڈھیر بنادیا.....جن کی شمشیرِ جانگیر جہاں دار ہوئی تو صرف دنیائے اسلام ہی نہیں، چین، روس اور یورپ کا بھی کوئی ملک ان کی لوٹ مار سے نہ بچا۔

تاتاری غلبہ محض عسکری غلبہ تھا

سو یہ بات نہیں کہ ایسا فساد اور ایسا بگاڑ امت پر پہلے آیا نہیں اور امت اس مصیبت سے گویا پہلے گذری نہیں، بلاشبہ امت خون کے دریا پار کر کے آئی ہے، ہاں! جو بات کل نہیں تھی، وہ آج ضرور سامنے ہے اور جو مصیبت کل پیش نہیں آئی تھی، آج وہ ضرور پیش آرہی ہے اور وہ یہ کہ صدیوں پہلے کے صلیبی اور تاتاری غلبے، تہذیبی اقدار سے خالی محض عسکری فتوحات تھے، جس نے بلاواسطہ ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں اور قریباً اتنے دیگر مذاہب کے لوگوں کو متاثر کیا، تاہم یہ تہذیبی قوت سے خالی تھے مثلاً تاتاری کہ ان کے پاس دینے کے لیے زیادہ زندگی سے بھرپور نظام نہیں تھا، وہ بدویانہ صفات کی حامل قوم تھی، جس کی عسکری قوت کو تموجن نامی ایک نوجوان نے اکٹھا کیا اور انہیں دنیا فتح کرنے اور عالم اسلام کو مغلوب کرنے کی راہ پر ڈال دیا، تسلیم کہ ان کی تلوار نے ہر تلوار کو کاٹا اور ان کے لوہے نے ہر لوہے کو کاٹا، وہ مگر تہذیب سے عاری ایک ایسی قوم تھی جو جلد ہی مفتوحین سے ہی ہار بیٹھی۔

تاتاریوں کا قبول اسلام

یہ بلاشبہ تاریخ عالم میں ایک یادگار واقعہ ہے کہ تاتاری پوری کی پوری قوم (قریباً) اسلام قبول کر گئی، حیرتناک مگر نہیں، کیونکہ تہذیب سے عاری فتوحات کو ایک جاندار تہذیب، جو اگرچہ تب شاندار اور پرجوش نہیں رہی تھی، تاہم مغلوبیت کے ماحول نے

اس کے اندر بے حد ملائمت اور نرمی رکھ دی تھی، اسی ملائمت اور بے پناہ نرمی نے ان پتھر دل بدویوں کو جوق در جوق متاثر کیا، اور تاریخ کے صفحات میں موجود ہے کہ تاتاریوں کی ایک شاخ کے چھ لاکھ لوگ ایک ہی دن میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

کچھ یہی حال صلیبی جنگوں کے دوران بھی تھا، صلیبی اقوام تب تہذیب اور تمدن سے دور جنگلوں والی زندگی گزار رہے تھے، پھر ایک تو وہ عسکری طور پر کہیں ٹک نہ سکے، دوسرے ایک غالب تہذیب سے خالی ہونے کی وجہ سے امت مسلمہ پر تہذیبی اور فکری اعتبار سے اثر انداز ہی نہ ہو سکے۔

انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ

آج کا مسئلہ مگر کل سے بالکل مختلف اور آج کی صورتحال کل کے مقابلے میں زیادہ گھمبیر ہے، آج مقابلہ بھی صرف ایک عسکری طور پر ہی غالب قوم سے نہیں.....اس میں تو کوئی دو رائے ہیں ہی نہیں کہ قریبا ایک صدی پہلے سے امت اول تا آخر یورپ کی دست نگر بن گئی ہے، سلطان ٹیپو شہید جس وقت شہید ہوا، کل دنیا کا سترہ فیصد سے زیادہ حصہ امت مسلمہ کے پاس تھا اور حضرت سلطان شہید کی شہادت کے پچاس سال بھی نہ گذرے تھے کہ یہ رقبہ گھٹتے گھٹتے پانچ فیصد تک رہ گیا، پھر اسی پر بھی بس نہ ہوا، بلکہ ایک پون صدی پہلے کا زمانہ تو ایسا تھا کہ چند ایک جگہ بالواسطہ اور باقی تمام عالم اسلام بلاواسطہ ان کے زیر نگین تھا، مالی لحاظ سے یہ لوگ جتنا لوٹ سکتے تھے انہوں نے عالم اسلام کو لوٹا اور جو نہیں لوٹ سکتے تھے، وہ بھی لوٹا یعنی اپنے مقامی خدام کے حوالے کر دیا، ملکوں کے ملک اس ''سفید آندھی'' نے خالی کروائے، شاہ جہان کا زمانہ کچھ زیادہ دور کا زمانہ تو نہیں اس کا وزیر سعد اللہ برحق کہہ گیا تھا کہ اگر جنت زمین پر آتی تو یہاں یعنی ہندوستان میں اترتی۔

حد یہ کہ انگریز اس زمانے میں ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہتے تھے مگر اسی ہندوستان کا حال ان کے جانے کے بعد کیا ہوا اور لوگ کس طرح نان جویں کو ترسنے لگے، یہ سمجھنے کے لیے ہمیں اتنا ہی کرنا پڑے گا کہ اپنے اردگرد ایک نگاہ دوڑائیں، یہی ایک منظر یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ ہمیں بہت بری طرح لوٹا گھسیٹا گیا ہے۔

سو یہ عسکری غلبہ تو اس مرتبہ بے تحاشہ تھا اور کسی طور بھی تاتاریوں کے غلبے سے کم نہ تھا بلکہ بوجوہ زیادہ تھا، کہ مصر اور ہندوستان جیسے وسیع ممالک ان تاتاریوں کی تباہیوں سے بچے رہے تھے، اور پوری لٹی پٹی امت کی پناہ گاہ بھی ٹھہرے تھے، ہندوستان میں جو دنیا جہاں کا علم و دانش پہنچا، اس کی ایک بڑی وجہ یہی تاتاری یورش تھی، جس نے پورے عالم اسلام کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔

نئی تہذیب، نئے روایات واقدار

بہرحال! معاملہ عسکریت تک رہتا تو کوئی بات تھی جو ملت اور تہذیب تاتاریوں جیسی جوان قوم کو جذب کر گئی تھی، اس کے لیے مشکل نہ تھا کہ عیسائیت کی بوسیدہ ہڈیوں پر توحید کی ایک عالی شان عمارت کھڑی کر دیتے، مصیبت مگر یہ تھی کہ اب کے یہ ممالک

اپنے ساتھ ایک نئی تہذیب، ایک جاندار تمدن، ایک غالب فکر اور سوچ لے کر آتے تھے، یہ اپنے سارے پرانے چھولے اتار پھینک کر عقل اور شعور سے روشنی لے کر مذہبیت کو پیچھے چھوڑ کر آئے تھے، ان کی جدید تہذیب مادے کے بے پناہ تاثیر سے معمور تھی۔

یہ سرمائے کو حرزِ جان اور مقصد حیات بنائے ہوئے تھے، خوشی اور مسرت کا زیادہ سے زیادہ حصول ان کا رہنما بنا بیٹھا تھا، بے حد اور بے انتہاء آزادی، جو خدائے واحد سے دور کردے، (چاہے نفس کا بندہ بیشک بنادے) ان کی مطمع نظر تھی، ان کے ایک ہاتھ میں جمہوریت کی تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں سرمائے کا دیو، ان کے سر پر خواہشات کے لامتناہی سراب اور ان کے حصول کے لیے لامتناہی سرمائے کے حصول کا آسیب سوار تھا، کبھی نہ پوری ہونے والی خواہشات کو لازماً دنیا کی چند روزہ زندگی میں لازماً پورا کرنے کی حرص ان کے تمام جذبوں پر حاوی تھی اور اب بھی ہے تب ان کو ملک گیری کا ہوس اسی لیے لگ بیٹھا تھا کہ اپنے بر فیلے اور ٹھنڈے براعظم میں یہ سب کچھ کرنے کے لیے ان کے پاس نہ اسباب تھے اور نہ اتنے افراد.....سو انہوں نے ہماری زمینوں کا رخ کیا اور پھر جو ہوا، بہت ہی خوفناک ہوا، تاہم اسی پر بس ہو جاتی، تب بھی کوئی بات تھی، آج جو مصیبت سروں پر منڈلا رہی ہے، وہ ان ممالک کی وہ غالب تہذیب ہے جو ہمارے بھڑکانے کے نت نئے طریقے، پھر ان کو پورا کرنے کے لیے تازہ بہ تازہ تدابیر.....اور نہ ختم ہونے والی ایسی بے حس اور جذبات سے عاری انسانی کاوشوں سے عبارت ہے، جن کا اختتام قبر سے پہلے ہوتا ہی نہیں۔

تہذیب جدید کے متعلقین کی دو قسمیں

آج یہ تہذیب بڑھ چڑھ کر ہمارے گھروں اور ہمارے ملکوں پر حملہ آور ہیں، اس تہذیب جدید کے متعلقین دو قسم کے ہیں، ایک حاملین اور دوسرے متاثرین، حاملین تو ان ممالک کے اپنے باشندے اور اس تہذیب کے رجال کار ہیں، سو ان کا معاملہ مشکل ضرور ہے، تاہم ناممکن نہیں کہ بہر حال وہ ہم میں سے نہیں اور اگرچہ ٹیکنالوجی اور سائنس نے مل کر دوریوں کو سمیٹ لیا ہے اور فاصلوں کو گھٹایا ہی نہیں، بیچ میں سے گویا بالکل ہی مٹا دیا ہے، تاہم پھر بھی ہمارے پاس ان سے نفرت کرنے اور ان سے بچنے کے لیے اتنا کچھ موجود ہے کہ جو ہمارا دفاع اور بچاؤ اچھا خاصا کرسکتا ہے، اور حق یہ ہے کہ اس معاملے میں قران نے ہمیں اتنا کچھ دیا ہے اور ان لوگوں کی حالت، جذبات اور عزائم کو یوں کھول کر ہمارے لیے بیان کیا ہے کہ کوئی کتنا بھی چاہے اور کوئی جتنا بھی ان کا نام نکالنا چاہے اور اس کے لیے کتنی ہی تاویلیں کیوں نہ کرے، اس سب کے باوجود قرآن میں اور جو تاریخ میں انہوں نے مسلم قوم کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، وہ اتنا واضح اور بدیہی ہے کہ ان سے کراہت ہوئے بغیر اور نفرت کیے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔

صرف یہی ایک جرم کہ سات سمندر پار کرنے اور آگ وخون کا ایک دریا بہا کر یہ لوگ ہماری زمینوں پر قابض ہو گئے اور سارے اندرونی، بیرونی خزانے لوٹ کر لے گئے، محض یہی عنوان ہی اتنا مؤثر ہے کہ امت کو بیک قلم سوچنے پر مجبور کرسکتا تھا، اور اس تہذیب اور اس کے حاملین کے ساتھ ایک جاندار مقابلہ ممکن تھا۔

تہذیب جدید کے متاثرین

خداوندی انوار سے بھری اسلامی تہذیب اب اتنی بھی درماندہ نہیں ہوئی ہے، اللہ اللہ کے زمزمے، قرآنی نغمے اور سنت کے چشمے اب بھی اس کی علمی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کرنے کے قابل ہیں، محاذ مگر اس وجہ سے کمزور پڑ گیا ہے کہ اس جنگ میں ان کو خود اپنے سے زیادہ ہمارے ہی کیمپ سے حمایتی مل گئے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں، جو یورپ کی آج کی تازہ تہذیب سے متاثر ہو گئے ہیں ان کو آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا انکار بھی کرتے نہیں بنتی کہ امت اس سلسلے میں شروع سے ہی بہت حساس رہی ہے اور انکار کے باوصف ان کا خود امت کے اندر ایک وجود بن کر رہنا ویسے ہی ناممکن بنکر رہ جائے گا، ان کو دین کے فہم کے لیے محمدی سرمے پر تو اعتبار نہیں، ہاں ہیگل، کانٹ اور ڈارون جیسے بے بصیرت، غیر معقولوں کی عقل کے سامنے ضرور سجدہ ریز ہیں۔

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں

یہ دیکھنے کی بجائے کہ خدا وہی ہے، خدا کا کلام وہی ہے، اس کلام کا معنی و مطلب وہی ہے یہ لوگ قرآن سے وہ کچھ برآمد کرنا چاہتے ہیں جو نہ خدا نہ چاہا ہے اور نہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا ہے۔

ع خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں

اس مصرع کے واقعی تفسیر بن کر یہ چاہتے ہیں کہ دین میں اجتہاد کیا جائے اور اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ مغربی تہذیب اور اس سے پھوٹنے والی تہذیبی خرافات کو عین اسلام ثابت کیا جائے، ان کی ساری کوششیں، ان کی ساری تگ و دو، ان کے سارے فلسفے بس اسی نکتے کے گرد گھوم رہے ہوتے ہیں، پنجہ فرنگ امت کے جسم سے شاید نکلا ہو کہ نہ ہو، تاہم روح امت ابھی تک اس کی سڑاند سے بھری پڑی ہے، ہر تھوڑی دیر بعد ایک نیا علامہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایک نئے اجتہاد کا دعوی کرتا ہے تاہم جب اس کا ریپر ہٹا دیا جاتا ہے اور اس کی ظاہری لش پش کو کھرچ دیا جاتا ہے تو اس کے اندر اسی مغربی حیوانی تہذیب کی سڑاند ہر کہ و مہ محسوس کر لیتا ہے۔

اجتہاد کے نام پر امت کے مسلمات پر ڈاکہ

اجتہاد کے نام پر امت کے مسلمات پر ڈاکہ ڈال کر دین کی قائم شدہ اور صیقل شدہ چار دیواری کو بزعم خود منہدم کرا کر مغربی تہذیب سے گندھی معاشرت کو عام کرنے کی سعی نا تمام ان لوگوں کی زندگی کا گویا واحد مشغلہ رہ گیا ہے، ان کا اجتہاد دین کے کسی معمول بہ عمل کی ترک سے شروع ہو کر دین کے کسی معلوم و معروف عقیدے پر تنقید پر ہی منتج ہوتا ہے، اور وہ اجتہاد (جو خداوند کی مرضی کو احکام میں ڈھونڈنے اور اس کی رضا کے نت نئے راستے معلوم کرنے کی خاطر گویا دین کے صافی چشمے میں دم بدم تازہ پانی کے دُر لانے کا انتظام تھا) کو ہی امت میں موجود چند ٹوٹی پھوٹی شکلوں کو بھی مسمار کرنے کے لیے اور جدید مغربی تہذیب کے ہر مظہر کو اسلامی بنانے کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔

فرزندان امت کی لڑائی مگر کس سے؟

لہٰذا اس وقت فرزندان امت کی لڑائی دوطرفہ ہے، ایک طرفہ خود یورپی تہذیب کے براہ راست عاملین سے، ان کی جدید ٹیکنالوجی اور جدید اکتشافات سے اٹھنے والی فکر ہے تو دوسری طرف خود اپنے ہی گھر میں موجود، یورپ کے ان فکری متاثرین سے ہے جو ہمارے ہو کر بھی ہمارے بننے کے لیے تیار نہیں، جو دین کی محمدی تشریح سے زیادہ ہیگلی اور ڈارونی تشریح پر ایمان رکھتے ہیں، یہ یورپی تہذیب ایک زندہ، جاندار اور اقدامی تہذیب ہے، اس کا مقابلہ بس وہی کر سکتا ہے اور وہی کرے گا جس کا ایمان و یقین اور عقیدہ راسخ ہو، اسباب دنیا سے قدم قدم پر متاثر نہ ہوتا ہے اسلام کو ہی کامل کامیابی کا واحد ذریعہ مانتا ہو، اور اسلام کی اسی تشریح کو مانتا ہو، جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے شاگردوں نے کی ہے اور اسی کو سرمایہ حیات جانتا ہو.....جو متاثر نہ ہو، مؤثر ہو، جو مدعو نہ بنے، داعی بنے، جو دفاع سٹینڈ پر نہیں، اقدام پر ہو، جو یورپی تہذیب کی کمزوریوں پر مضبوط گرفت رکھتا ہو، اس کی خامیوں سے باخبر ہو اور اس کے نقصانات کا درست علم رکھتا ہو، ورنہ یہ آندھی اب کے اتنی زور آور ہے کہ بڑے بڑے تناور درختوں کو اکھاڑے جا رہی ہے، بس جو صدا لگاتا رہیگا، وہی جاگتا رہے گا، سو لوگو! جاگتے رہو، جاگتے رہو۔

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

پر ہے مئے خوں رنگ سے ہر شیشہ حلب کا

حلب عہد رفتہ کی تاریخ میں آئینہ سازی اور شیشہ گری کی صنعت میں پوری دنیا میں مشہور تھا دنیا کے امراء اور اصحاب ثروت اپنے عیش کدوں شبستانوں اور نگار خانوں کے لئے حلب کے آئینے اور جام و مینا اور دیگر ظروف استعمال کرتے تھے، اقبال نے بھی اس کا ذکر کیا ہے ع زخاک تیرہ دروں تابشیشہ حلبی آج شیشہ حلب خون انسانی سے لبریز ہے، جسے ایرانیوں اور روسیوں نے بشار جیسے ظالم اور خودسر کی حمایت میں پانی سے زیادہ ارزاں کر دیا ہے، خون انسانی وہاں سستا اور ہر طرف بہتا ہے، دنیا کے ملکوں نے تسلیم کیا ہے کہ ان طاقتوں نے جنگی جرائم کا ارتکاب کیا ہے، حلب میں قیامت سے پہلے قیامت برپا ہو رہی ہے لوگ زندگی اور موت کی کشمکش اور کشاکش سے گذر رہے ہیں، کئی لاکھ انسانوں نے اپنی متاع جاں قربان کر دی ہے، کھلے آسمان سے معصوم شہریوں پر بمباری اور ٹینکوں سے گولہ باری اور بکتر بند گاڑیوں سے آتش باری کے نتیجہ میں سینکڑوں کئی منزلہ عمارتیں ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی ہیں اور مال و متاع خاکستر ہو رہا ہے۔ کسی گھر سے کوئی آواز آتی ہے تو آہ و کراہ کی، زخمیوں کے فریاد کی، نالہ وشیون کی، کوئی اگر کسی شکستہ اور مسمار شدہ گھر سے زخمی حالت میں کسی کی مدد سے بچالیا جاتا ہے تو طبی مدد کے آتے آتے اس کا تار نفس ٹوٹ جاتا ہے اور اگر کوئی اس سیلاب بلا سے اور موت کے طوفان سے زندہ سلامت بچا ہوا ہے تو وہ بھی اپنی زندگی سے مایوس ہے اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو کہتا ہے کہ الموت قادم الینا موت جو مقدر ہے بس اس کے آنے کی دیر ہے، خون کے دریا میں کشتی جاں کو سلامت لے جانا مشکل ہے، ہمارے اہل وعیال موت کے منہ میں جا چکے اور ہم بھی اب اس خراب خانہ حیات سے جانے والے ہیں یہ میرا آخری بیان ہے اس کے بعد تم میری آواز کبھی نہیں سن سکو گے اور صرف اتنا ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے جس کا بیان کرنا مشکل ہے۔

حلب کا شہر نگاراں گنج شہیداں اور مقامات آہ وفغاں سے تبدیل ہو گیا ہے، وہاں عصمتیں تار تار ہوگئی ہیں، وہاں کے ایک ستم رسیدہ شخص نے دنیا کے علماء سے فتوی پوچھا ہے کہ ایران اور حزب اللہ اور بشار کے جابر و قاہر اور فاسق و فاجر فوجی ہمارے گھروں میں گھس کر زبردستی ہماری بیٹیوں کی عصمت ریزی کر رہے ہیں اور ہم بے بس ہیں کیا اس ننگ و عار سے بچنے کیلئے یہ جائز ہوگا کہ ہم اپنی بیٹیوں کو مار ڈالیں؟ ملک شام میں موت کی بھیانک آندھی چل رہی ہے اور دنیا تماشہ دیکھ رہی ہے اور مذمت کے کچھ الفاظ بول کر اور لب ہلا کر رہ جاتی ہے، دنیا کی تاریخ میں چشم فلک نے جور وستم کے ایسے منظر کم دیکھے ہیں، لوگوں کے پاس کھانے کے لئے ایک دانہ نہیں

ہے، پینے کے لئے قطرہ آب نہیں ہے، سخت سردی اور زمستانی ہوا میں ان کے پاس کپڑے نہیں ہیں، سر پر سائبان نہیں ہے، کوڑے کے ڈھیر سے وہ اپنی غذا حاصل کررہے ہیں، تاریخ میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ پورا شہر غلاظت کے ڈھیر سے اپنی غذا چن رہا ہو، ہسپتالوں میں دوائیں نہیں بے ہوشی کی دوا کے بغیر ڈاکٹر آپریشن کرنے پر مجبور، لوگ اپنے مسمار شدہ گھروں کو چھوڑ کر جارہے ہیں لامعلوم منزل کی طرف اور نامعلوم مستقبل کی طرف، پابجولاں لرزاں وترساں بادیدہ گریاں باقلب بریاں، سامان بدست، طفل بردوش۔

شام کا جو منظر نامہ ہے اس سے پوری دنیا واقف ہوچکی ہے، دنیا کا ضمیر اگر بیدار نہیں ہوتا تو اس کو دہراتے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، یہ کوئی قند مکرر نہیں جس کا بیان کرنا پر لطف ہو، اصل ضرورت یہ ہے کہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کا حل تلاش کیا جائے، ہم ببانگ دہل کہتے ہیں کہ اصل مجرم پڑوس کی وہ عرب مسلم حکومتیں ہیں ان کو اللہ نے سیال سونے کا سمندر بخشا تھا اور انہوں نے اس کی قدر نہیں کی، قرآن مجید نے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں سے جہاد کے لئے اور مسلمانوں کی دادرسی کے لئے حربی اور عسکری تیاری کا واضح حکم دیا تھا، وَأَعِدُّوا لَهُم مَا استَطَعتُم یہ قرآن کی معروف اور مشہور آیت ہے، اپنی دولت سے عیش وعشرت میں ڈوبنے کے بجائے ان عربوں کو کارخانے قائم کرنے تھے، صنعتی انقلاب لانا تھا، اسلحہ سازی کرنی تھی، راکٹ بنانے تھے، جنگی جہازوں کی تیاری کے لئے منصوبے تیار کرنے تھے، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں ان کی اپنی تیار کردہ ہوتیں وہ اسلحہ تیار کرتے مقابلہ کے لئے بم بنائے جاتے، فضائل جہاد پر کتابیں لکھی جاتیں اور ملک میں اور فوج میں تقسیم کی جاتیں اور یہ سب اس لئے کیا جاتا کہ کوئی ان پر ظلم نہ کرسکے اور کوئی ان کے حقوق پر دست درازی نہ کرسکے، کوئی ان کی زمین پر غاصبانہ قبضہ نہ کرسکے جیسا کہ فلسطین میں کیا گیا، اس وقت مسجد اقصی، قرآن کی آیت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے دوسروں کے قبضہ میں ہے۔ یہ عرب حکمراں قیامت کے دن باز پرس سے بچ نہیں سکتے۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ جب سندھ میں قزاقوں کی جیل میں قید اور محبوس ایک ستم رسیدہ لڑکی نے بصرہ کے گونر حجاج بن یوسف سے فریاد کی اور یہ لکھ بھیجا کہ یہاں بیشمار بیوائیں اور یتیم بچے آپ کی مدد کے منتظر ہیں اور آپ کیسے حاکم ہیں کہ آپ کے ہوتے ہوئے اہل ایمان پر ظلم ڈھایا جارہا ہے اور آپ کچھ نہیں کررہے ہیں؟ حجاج بن یوسف کا بیان ہے جو تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ اس بیان کو پڑھ کر میرے دن کا سکون اور رات کی نیند ختم ہوگئی، مجھے اس فکر نے کھانے پینے سے روک رکھا ہے پھر تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے کہ اس نے دنیا کے نقشہ میں جو اس کے سامنے تھا، ہندوستان کی جگہ پر اپنا خنجر پیوست کردیا، یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اس نے سندھ پر حملہ کا فیصلہ کرلیا ہے اس نے سندھ کے راجہ داہر کو پہلے خط لکھا کہ مسلمان عورتیں اور بچے جو اس کی قید میں ہیں فورا رہا کردے اور جب راجہ داہر نے انکار کیا اور یہ لکھا کہ بحری قزاقوں نے یہ حرکت کی ہے اور ان پر میرا کوئی بس نہیں ہے تو اس نے چڑھائی کا ارادہ کیا اور سترہ سالہ سالار محمد بن قاسم کی سرکردگی میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کی اجازت سے اس نے فوج بھیجی۔

ایک بے بس لڑکی کی فریاد سن کر حجاج بن یوسف کی نیند اڑ گئی تھی، آخر شام کی ہزاروں عورتوں اور بچوں کی آہ اور کراہ مسلم حکمرانوں کی نیند کیوں نہیں ختم کرتی ہے؟ وہ کیوں اپنے شبستانوں میں چین کی نیند سوتے ہیں کیوں ان کا خون سرد ہوگیا ہے؟ کم سرمایہ

سے یورپ میں صنعتی انقلاب آیا تھا، سیم وزر کی ریل پیل کے باوجود عرب حکمراں کیوں اپنے ملک کو طاقتور بنانے پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کرتے ہیں، وہ کیوں صنعتی انقلاب لانے پر اپنی پوری توجہ مبذول نہیں کرتے؟ اس کے لئے پورے عالم اسلام سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان کے جوہر قابل کو کیوں نہیں اکٹھا کرتے ہیں؟ کیا یہ باتیں انہیں حکمرانی کے لئے نااہل بے شعور کم حوصلہ نہیں ثابت کرتی ہیں؟ عیش وعشرت میں مشغول شام کے پڑوسی عرب اسلامی ملکوں میں یہ جرات نہیں کہ شام کے مظلوموں کو ظلم سے بچا سکیں اوران کی دادرسی کرسکیں، دولت کے نشہ میں چور خلیجی حکومتوں کو یہ ہمت نہیں کہ مسجد اقصی کو واگذار کراسکیں، آرام طلب عیش کوش عرب حکمرانوں کو یہ توفیق نہیں کہ اسرائیل کو بے دخل کر کے اصل فلسطینی باشندوں کو اس سرزمین پر بسائیں، افغانستان اور عراق کے دلخراش حادثے گذر گئے موج خوں سر پر سے گذر گئی، لیکن ان حکمرانوں کی سرمستیاں اور خرمستیاں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں، دنیا میں اسلام نشانہ پر ہو اور ہر طرف مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو، ان کے ساتھ خون کی ہولی کھیلی جارہی ہو، ان کی عمارتیں گرائی جارہی ہوں ایسی حالت میں اگر اسلامی غیرت وحمیت کی رمق بھی باقی ہو تو چین کی نیند سونا مشکل ہوگا، ذرا سوچئے کہ اگر یہ عرب ملک بھی امریکہ اور روس اور مغربی ملکوں کی طرح طاقتور ہوتے تو شام میں مدد اور مداخلت کی پوزیشن میں ہوتے یا نہیں ہوتے؟ روس شام سے کتنے زیادہ فاصلہ پر ہے لیکن روس کی مدد سے بشارالاسد نے کھوئے ہوئے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا ہے۔

عرب حکمراں یا تو ملک میں صنعتی انقلاب لائیں اسلحہ سازی کی جانب توجہ دیں اور صرف وہ چیزیں استعمال کریں جو ان کا ملک خود تیار کرے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک اسلام کی کھوئی ہوئی حرمت کی بازیابی نہ ہو جائے یا پھر اقتدار کی کرسی اہل اور با صلاحیت لوگوں کے حوالہ کردیں، افسوس! اس وقت ایک ترکی بچا ہے جو ہر وقت بڑی طاقتوں کے نشانہ پر ہے، شام میں اس وقت جو کچھ ہوا ہے، خلیجی اور غیر خلیجی حکمران اس کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے، انہوں نے بے پناہ دولت کے باوجود صنعتی انقلاب لانے کی کوشش نہیں کی اور نہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ان کی کوئی پیش رفت ہوئی اور نہ انہوں نے اپنے عوام کو اظہار خیال کی وہ آزادی دی جو اسلام نے عطا کی تھی، انہوں نے اپنے عوام کو بے زبان جانوروں کی طرح بنا کر رکھا ہے، اور وہ خود ہوس رانی اور عیش کوشی میں مگن رہے، اور دنیا مسلمان ملکوں کو پامال کرتی رہی، روندتی رہی، اوران پر ظلم کے پہاڑ توڑتی رہی وہ سب کچھ کر گذرے اور عرب مسلم حکمراں خاموشی کے ساتھ صرف تماشہ دیکھتے رہے یا صرف مذمت کی تجویز پاس کرتے رہے اور اقوام متحدہ سے اپیل کرتے رہے، انہوں نے تارکین وطن کو پناہ تک نہیں دی ان میں بہت سے لوگوں نے بے پناہی کے عالم میں سمندری راستہ سے ربڑ کی کشتیوں پر یورپ کے ملکوں کا رخ کیا، نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی، یہ امان یوروپ کے ملکوں میں ملی، جہاں اب عیسائی مشنریاں ان کو عیسائی بنانے میں مصروف ہیں۔

عرب مسلم حکمرانوں کے بعد سب سے زیادہ ذمہ داری عالم اسلام کے علما اور مفکرین پر عائد ہوتی ہے کہ انہوں نے مسلم عرب حاکموں کی رہنمائی کیوں نہیں کی؟ مجھے علم ہے کہ عرب ملک کے اندر وہاں کے جن مفکرین نے حکومت کی غلط پالیسی پر زبان کھولی ان کی زبان کاٹ دی گئی۔ ان کو نظر بند کردیا گیا، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ وہاں کے علما کی اکثریت نہ صرف خاموش رہی بلکہ اس نے حکومت کے

غلط فیصلوں کی تائید کر ڈالی ان تائید کرنے والوں میں مفتی بھی ہیں، قاضی بھی ہیں، عالم بھی ہیں اور امام بھی ہیں، لیکن ان ملکوں کے باہر کے علما کو کیا ہوا کہ وہ اس اہم موضوع پر نہ لکھتے ہیں نہ بولتے ہیں، انہوں نے اپنے لبوں پر سکوت کی مہر لگا ڈالی ہے اور جب وہ ان ملکوں کی کسی تنظیم کی کانفرنس میں جاتے ہیں تو صرف اپنا کشکول گدائی ساتھ لے کر جاتے ہیں اور اپنے اداروں کی تعمیر کے منصوبے پیش کرتے ہیں اور زبان حال سے کہتے ہیں.....

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

برصغیر خود ایک چھوٹا عالم اسلام ہے ان میں کتنے عالم ہیں اور کتنے مسلم تنظیموں کے سربراہ ہیں جنہوں نے عرب حکمرانوں کو ان کی غلطیوں کی طرف توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی ہو؟ شاید کسی نے نرمی کے ساتھ اور حکمت کے ساتھ بھی کوئی ایسی کوشش نہیں کی، جب وہ رہبری نہیں کریں گے تو پھر کون رہبری کرے گا، عرب مسلم حکمرانوں پر اخبارات میں جو عام طور پر خوگر حمد ہوتے ہیں اور سفارت خانوں کے ذریعہ نگاہ لطف و کرم کے امیدوار ہوتے ہیں کبھی کبھی تنقیدیں بھی شائع ہوتی ہیں، لیکن یہ سفارت خانے جہاں تمام اخبارات آتے ہیں اور مترجمین بھی ہوتے ہیں، ان تنقیدوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے اور متعلقہ ملکوں کے وزارت خارجہ میں اس کی رپورٹ نہیں کرتے ہیں وہ صرف قصیدہ خوانیوں کی رپورٹ پیش کرتے ہیں اور قصیدہ خواں اخبارات کو بطور رشوت مراسم خسروانہ سے نوازتے رہتے ہیں۔

ملک شام کے حکمراں کا ظلم سب سے سوا ہے اور اس ظلم کو سب سے زیادہ مدد اور طاقت ایران کی نام نہاد اسلامی حکومت سے ملتی رہی، ایران کا یہ وہ جرم ہے جسے تاریخ معاف نہیں کر سکے گی، ایران کے بے شمار شیعی مجتہد علما الجزیرہ ٹی وی پر یہ بیان دے چکے ہیں کہ شام کے سلسلہ میں ایرانی حکومت کا موقف امام حسین کے روح جہاد کے مغایر ہے یہ یزید کی پیروی اور ہمنوائی ہے، لیکن ان کو اپنے ملک کے اندر اظہار خیال کی آزادی حاصل نہیں ہے، ایرانی لابی کے وہ ہندوستانی صحافی بھی مجرم ہیں جو سطور میں اور کبھی بین السطور میں بشار الاسد کی حمایت کرتے ہیں اور جب ظلم کی حمایت سے دل سیاہ ہو جاتا ہے تو ہر ظلم کی حمایت ان کا شیوہ بن جاتا ہے، وہ اس ظلم کے بھی طرف دار اور حامی بن جاتے ہیں جسے حکومت جمہوریت کے دعوے کے باوجود غیر جمہوری طور پر ڈاکرنائیک پر روا رکھتی ہے، ایرانی لابی کے ایسے تمام صحافیوں کا اور ان کے اخبارات کا بائیکاٹ کرنے کی ضرورت ہے۔

بشار الاسد اور اس کے باپ حافظ الاسد دونوں نے شام میں اسلام پسندوں کو اور جمہوریت پسندوں کو ظلم کا نشانہ بنایا تھا، اسلام نے ظلم کے خلاف کھڑا ہونا سکھایا ہے، جس کی ابتدا واقعہ کربلا سے ہوتی ہے، اس لئے بشار کی حکومت کے خلاف کھڑا ہونا درست ہے، دنیا میں مسلمانوں نے طویل عرصہ تک حکومت کی ہے، ہمیشہ انصاف اور رواداری اسلام کی تاریخ کا طرہ امتیاز رہا ہے، اسلام کا مقصد جنگ انصاف کی بنیادوں کو مضبوط کرنا لیکن حلب کی جنگ میں بشار اور ایران اور روس کے ہاتھوں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ انسانیت کا قتل ہے اور اس سے پوری انسانیت شرمسار ہے اور یہ دردمند دلوں کے لئے دل کا داغ اور سینہ کا چراغ ہے.....

تھمے کیا دیدہ گریاں حلب کی نوحہ خوانی میں عبادت چشم من کی ہے ہر دم باوضو رہنا

مفتی محمد یاسر نعمانی
معلم شعبہ کمپیوٹر جامعہ دارالعلوم حقانیہ

دینی علوم کی ڈیجیٹالائزیشن کی تحریک

گلوبلائزیشن کے اس دور میں ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی سے دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں کہ اس سے متاثر نہ ہو، کتابی ذوق بھی روز بہ روز ختم ہوتا جارہا ہے اس صورت حال میں بعض افراد نے کوشش کی کہ جدید ٹیکنالوجی کو مطالعہ کیلئے موثر بنایا جائے، ویسے تو عالمی دنیا اور خصوصاً عصری اداروں میں ڈیجیٹل لائبریریوں کا رجحان بہت پہلے سے ہی موجود تھا تاہم دینی اداروں میں ڈیجیٹل لائبریریوں کی طرف رجحان چند سالوں کی بات ہے، بہت سے ادارے اس سلسلے میں فعال ہوئیں، جس میں ادارہ علم دین اور اس کے متحرک اراکین ڈیجیٹل لائبریریوں کی فروغ میں مؤثر اور میں فعال کردار ادا کرتے ہوئے نہایت بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں، دینی علوم کی ڈیجیٹالائزیشن کے تعارف کے حوالے سے درج ذیل مضمون نہایت اہم معلومات فراہم کرتی ہے جسے افادہ عامہ کی خاطر پیش کیا جارہا ہے (ادارہ)

اپنے وسیع تر مفہوم میں ہر وہ تحریر جو کسی بھی شکل میں محفوظ کردی جائے، کتاب کہلاتی ہے، انسان نے جب سے اپنے خیالات وافکار کو تحریر کا جامہ پہنانا شروع کیا ہوگا، غالباوہی گھڑی کتابوں کا نقطہ آغاز ہوگی، کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں تختیوں، ہڈیوں اور جھلیوں پر تحریریں محفوظ کردی جاتی تھیں اور یہی کتاب کی ابتدائی شکل تھی پھر ایک لمبے سفر کے بعد کاغذ ایجاد ہوا اور اسے تحریروں کی حفاظت کے لیے استعمال کیا جانے لگا، پندرہویں صدی میں چھاپ خانے کی ایجاد نے تو کتاب کی صنعت میں انقلاب برپا کردیا اور یوں کتاب اپنی موجودہ شکل میں ڈھل کر ہمارے سامنے آئی، انسان کے ذہنِ رسا نے شاید ہی کتاب سے مفید کوئی ایجاد کی ہو، یہ کتاب ہی ہے جو علم ومعرفت کا سب سے بڑا منبع ہے اس کے ذریعے انسان کے عقل وشعور میں پختگی آتی ہے اور یہی اس کی فکر کی سطح کی بلندی کا ذریعہ بنتی ہے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے اور تہذیبِ انسانی اس بات کی گواہ ہے کہ کتب خانے ہمیشہ سے تحریری اور غیر تحریری مواد کی حفاظت کا واحد ذریعہ ہیں، تہذیبِ انسانی اپنی منفرد تہذیب وتمدن کے فروغ اور انسانی عقل ودانش کے ارتقا میں کتب خانوں نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے ان ہی کی بدولت علوم وفنون نہ صرف زیادہ پھیلا ہے بلکہ جدید ترین سائنسی اور مشینی ترقی ان ہی کی مرہونِ منت ہے، انسان فانی ہے لیکن اس کی صلاحیتیں، اس کا علم، اسکے خیالات ونظریات جو اس نے اپنی زندگی سے حاصل کئے ہیں انہیں

تحریری صورت میں آئندہ آنے والی نسلِ انسانی کی رہنمائی، بہتری اور ترقی کے لئے قلمبند کیا، یہ سب علمی سرمایہ دنیا کے گوشے گوشے کے کتب خانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ رہے گا، یعنی وہ عمارت کتب خانہ کہلاتی ہے جہاں کتابوں کے ذخیرے ایک غیر معمولی ترتیب اور مقررہ ضوابط کے تحت اس بہترین طریقے سے آراستہ ہوں کہ اس سے استفادہ کرنے میں نہ تو کسی قسم کی زحمت اٹھانی پڑے اور نہ ہی وقت کا نقصان ہو۔

گزشتہ ادوار میں لاتعداد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ تا ہنوز جاری وساری ہے، ان میں سے بے شمار کتب ایسی ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ نایاب ہو چکی ہیں اور عام مارکیٹ میں دستیاب نہیں تاہم بیشتر کتب اب بھی اصل صورت میں پاکستان اور ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں میں محفوظ ہیں لیکن ان کتب کو نایاب قرار دیکر ان تک عوام الناس کی رسائی کو مسدود اور محققین کی رسائی کو محدود بنا دیا گیا ہے، لیکن علمی تحقیق کا تقاضا ہے کہ ان کتب تک خواص وعوام کی رسائی کو نہ صرف ممکن بنایا جائے بلکہ یہ رسائی سہل ترین ہو تا کہ تعلیم وتعلم اور تحقیق وتدقیق کی راہیں مسدود نہ ہوں اسی فکر کی جدوجہد میں انٹرنیٹ سے منسلک ہوتے ہی ہمارا واسطہ لاتعداد ڈیجیٹل لائبریریوں سے پڑتا ہے جو برقی کتب کی مقبولیت کے نتیجے میں وجود میں آئیں یہ ای لائبریریز (E-LIBRARIES) بھی کہلاتی ہیں ان برقی مکتبوں میں لاکھوں کتابیں دستیاب ہیں، جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انٹرنیٹ آرکائیو (Internet Archive Library) نامی ایک برقی لائبریری میں تیس لاکھ کے قریب کتابیں موجود ہیں، جبکہ یونیورسل ڈیجیٹل لائبریری (Universal Digital Library) اور اوپن لائبریری (OpenLibrary) میں دس دس لاکھ کتابیں پڑھنے کے لیے دستیاب ہیں، گوگل بکس (Google Books) اور پراجیکٹ گٹن برگ (Project Gutenberg) نام کی لائبریریوں میں بھی لاکھوں کتابیں مل جاتی ہیں کئی لاکھ عربی کتابوں پر مشتمل المکتبة الشاملة، المکتبة الوقفية وغیرہ بھی ان برقی لائبریریوں میں سے ایک ہے، نہ صرف یہ بلکہ ان لائبریریوں میں کتابوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک حسین کڑی مولانا حافظ ذیشان صاحب چشتی حفظہ اللہ تعالی (فاضلِ جامعہ مدنیہ جدید، لاہور) کا مکتبہ جبریل بھی ہے، مولانا ذیشان صاحب آج سے دس برس قبل اپنے طالبِ علمی کے زمانہ سے ہی ایک ایسا علمی مشغلہ اِختیار کیا جو مستقبل کے لیے نہایت اہمیت کا حامل اور جدید عصری تقاضوں کے عین مطابق اور بروقت تھا وہ بڑی پابندی سے اسباق میں حاضر رہتے اور خاموشی اور لگن کے ساتھ عصری دوڑ میں حصہ دار رہتے، بے سروسامانی کے باوجود اردو دینی کتب اور دیگر دینی مواد کے ضخیم ذخیرہ کی ڈیجیٹل شکل میں منتقلی کے عظیم کام کا بیڑا انہوں نے تن تنہا اپنے سر لیا، اللہ تعالی نے ان سے یہ بڑا کام لینا تھا اس لیے ان کے دل ودماغ کو پوری طرح اِس طرف متوجہ کر دیا اور اِس عمل کا آغاز اردو دینی کتب کے حوالے سے پوری دنیا میں پہلی بار اللہ تعالی نے ان کے ہاتھوں کرا دیا اس کام کی پہلی اینٹ رکھنے کا اِعزاز عزیزم مولانا ذیشان صاحب چشتی سلمہ اللہ تعالی کو نصیب ہوا چار پانچ سال قبل اللہ تعالی کی مزید مدد شاملِ حال ہوئی کہ اِس کام کو فنی ماہرین کی اِضافی خدمات بھی حاصل ہو گئیں اور ''مکتبہ جبریل'' کے نام سے پہلے سے بہتر انداز میں ترقی کا سفر شروع ہوا۔

مکتبہ جبریل کی خصوصیات

یہ مکتبہ اردو کتب کا سب سے بڑا اور نہایت کارآمد سوفٹ ویئر ہے جس کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:

☆ اس میں المکتبۃ الشاملۃ کی طرز پر تفسیر، حدیث، فقہ، فتاوی، ادب، تاریخ اسلامی و دیگر علوم وفنون کی متعلقہ کتب کے عکسی صفحے (پی ڈی ایف فارمیٹ) میں موجود ہیں اور ایک ہزار کے قریب کتب یونیکوڈ (قابل تعین وقابل تلاش) مواد کی صورت میں موجود ہیں اس میں کتاب کی تلاش کے تینوں طریقے (کتاب کے نام، مصنف اور عنوان کے اعتبار سے) نہایت آسان کر کے ڈیجیٹالائز (Digitalis) کئے گئے ہیں جس سے ہزاروں نتائج میں سے مطلوبہ کتاب تک با آسانی رسائی ممکن ہے۔

☆ سافٹ ویئر میں موجود مذکورہ تقریبا ایک ہزار یونیکوڈ کتب کی کسی بھی اردو اور عربی عبارت تک تلاش کے ذریعے بآسانی پہنچا جاسکتا ہے، بلکہ ایک مضمون کو مذکورہ بالا تمام کتابوں میں بیک وقت تلاش کیا جاسکتا ہے۔

☆ کسی بھی آیت کی تفسیر تک بیک وقت سافٹ ویئر میں موجود تمام تر تفاسیر میں چند سیکنڈوں میں رسائی ممکن ہے، خصوصاً تفسیر پڑھانے والوں اور درس قرآن دینے والے تمام حضرات کے لیے یہ بہترین تحفہ ہے۔

☆ درس نظامی کی تمام کتب وشروحات سے بآسانی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

☆ سافٹ ویئر سے کتاب کو نکالنے کی سہولت موجود ہے، جس سے کوئی بھی کتاب با آسانی اپنی مرضی سے دوسری جگہ یا یو ایس بی (USB) وغیرہ میں منتقل کی جاسکتی ہے

☆ کسی بھی کتاب کے کچھ مخصوص صفحات یا مخصوص مضامین کو محفوظ کر کے پرنٹ کیا جاسکتا ہے۔

☆ اس سافٹ ویئر کی اہم ترین اور حیران کن خصوصیت (جو المکتبہ الشاملۃ میں بھی نہیں)، یہ ہے کہ اگر کوئی محقق کسی خاص عنوان پر تحقیق کرنا چاہتا ہے اور ہزاروں صفحات کے مطالعے کے دوران اس تحقیق سے متعلقہ خاص مواد یکجا کرنا چاہتا ہے، تو وہ بآسانی کرسکتا ہے، اسی طرح ایک وقت میں ایک سے زیادہ تحقیقات قائم کر کے دوران مطالعے مختلف تحقیقات سے متعلق مختلف صفحات کو مقررہ تحقیقات کے سپرد کرنا چاہے تو بہ سہولت کرسکتا ہے۔

جس کے بعد ہر ہر تحقیق سے متعلق مواد اس خاص تحقیق میں بہ سہولت ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، مثلاً اگر مسافر کے احکام ومسائل، مریض کے احکام ومسائل، جہاد کے احکام ومسائل کو یکجا کرنا چاہتا ہے اور اس غرض سے کتب فقہ کا مطالعہ کرتا ہے، جہاں متفرق طور پر کہیں مسافر کا مسئلہ مل گیا تو کہیں مریض کا یا کہیں جہاد کا کوئی

مسئلہ مل گیا، دوران مطالعہ محقق یہ چاہتا ہے کہ مسافر سے متعلق مسئلہ قائم کردہ تحقیق مسافر کے احکام ومسائل کے سپرد ہوجائے، اسی طرح مریض سے متعلق مسئلہ مریض کے احکام ومسائل کے سپرد اور جہاد سے متعلق مسئلہ جہاد کے احکام ومسائل کے تحت آئے تو بآسانی وہ اپنی قائم کردہ تحقیق تک متعلقہ مواد پہنچا سکتا ہے، جس سے ضبط وترتیب نہایت آسان ہوجاتی ہے اور مطالعہ کی طرف توجہ مرکوز رہتی ہے نہ کہ یہ فکر کہ کس طرح اسے ضبط کیا جائے، نیز اپنی اسی تحقیق کو ایم ایس ورڈ (MS Word) فائل کی صورت میں محفوظ کر کے پرنٹ بھی لیا جاسکتا ہے۔

☆ اگر کوئی نئی کتاب مکتبہ میں داخل کرنا چاہے تو درآمد کے آپشن کے ذریعے شامل کی جاسکتی ہے، لیکن کوئی بھی مصنف اپنی مرضی سے اس سافٹ ویئر میں اپنی تصنیف شامل کرنا چاہتا ہے تو وہ علم دین کی ٹیم سے مشورہ کر کے شامل کرسکتا ہے۔

مکتبہ جبریل کی آن لائن سہولت

اللہ تعالی کے فضل سے علم دین ویب سائٹ انتہائی قیمتی اضافوں کے ساتھ اپ ڈیٹ ہوچکی ہے جن میں اہم یہ ہیں۔

☆ مکتبہ جبریل آن لائن لائبریری باقاعدہ مطالعہ کی سہولت کے ساتھ آفیشل ویب سائٹ پر اپلوڈ Upload کردی گئی ہے، یعنی اب آپ کو مستند دینی کتب کے مطالعہ اور ان میں طاقت ور تلاش سے استفادہ کرنے کے لیے صرف انٹرنیٹ کنکشن کی ضرورت ہے۔

☆ مکتبہ جبریل (آن لائن لائبریری) کا شجرہ احسن طریقے سے دینی علوم وفنون کے اعتبار سے مرتب شدہ شکل میں ہے یہ وہی ترتیب جو کہ مکتبہ جبریل ونڈوز میں موجود ہے۔

☆ ہر قسم کی کتاب کتاب نام کتاب، نام مصنف، نام ناشر سے اسے باآسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

☆ اب آن لائن مکتبہ میں موجودہ کتب یونیکوڈ (Unicode) اور پی ڈی ایف (PDF) دونوں صورتوں میں مطالعہ کی جاسکتی ہے، اسی طرح تلاش کے نتائج بھی دونوں طرح کی کتب سے مطالعہ کیے جاسکتے ہیں۔

☆ مطالعہ سے پہلے کتاب کی تفصیلی معلومات دیکھی جاسکتی ہیں تاکہ کوئی دقت نہ اٹھانی پڑے۔

☆ کتاب کے عناوین کی فہرست کتاب کے ساتھ موجود ہے تاکہ متعلقہ موضوع تک پہنچنا مطالعہ کے وقت آسان ہو۔

☆ پی ڈی ایف (PDF) کتب کی ڈاؤن لوڈ ممکن ہوچکی ہے، اب اپنی ضرورت کی ایک یا اس سے زیادہ کتب کی پی ڈی ایف (PDF) فائلیں علم دین ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے۔

☆ تلاش کی قوت میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہوچکا ہے۔

☆ نئی شامل کردہ کتب کی سہولت کے ذریعے مکتبہ میں اضافہ شدہ نئی کتب کے بارے میں باقاعدگی سے خبر ملتی رہیگی

☆ مکتبہ کے اعداد وشمار کے ذریعے مکتبہ میں موجودہ کتب کا طائرانہ جائزہ ممکن ہوگا۔

☆ ڈاؤن لوڈ پیج کی ترتیب نو، جس میں مکتبہ جبریل ونڈوز کا خالی نسخہ فراہم کیا گیا ہے تا کہ مخصوص کتب کا ڈاؤن لوڈ ممکن ہو سکے مکتبہ جبریل ونڈوز میں اور تازہ ترین مکمل نسخہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں بھی فراہم کیا گیا ہے تا کہ کم رفتار انٹرنیٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ با سہولت رہے

مکتبہ جبریل ورژن ۲ میں اہم فیچرز: انڈیکس کی سہولت

مفہرس اور گولڈن ڈکشنری فتاوی استعمال کرنے والے احباب جانتے ہیں کہ ان دو مکتبات میں ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں تلاش کے وقت ایک تو تجاویز آتی ہیں جس کی مدد سے تلاش کے لیے الفاظ کے انتخاب میں بہت سہولت ہو جاتی ہے اور دوسرا تلاش کے نتائج لمحہ بھر میں سامنے آجاتے ہیں، الحمدللہ مکتبہ جبریل ونڈوز ورژن 2 میں انڈیکس کی خوبی شامل کی گئی ہے۔

مکتبہ کی رپورٹ کا حصول

جیسے المکتبہ الشاملة میں مکتبہ کی کتب کی رپورٹ حاصل کی جاسکتی ہے، اسی طرح کی سہولت مکتبہ جبریل میں اضافہ کی گئی ہے جس کی مدد سے کسی خاص فن، مجموعے یا پھر پورے مکتبہ کی رپورٹ حاصل کی جاسکتی ہے، اس سہولت کا فائدہ خاص طور پر ان حضرات کو ہوگا جو کہ ڈیجیٹل چیزوں کی جامعیت سے واقف نہیں۔ ان کے سامنے جب یہ لسٹ رکھی جائے گی تو ان کے لیے اندازہ کرنا آسان ہوگا کہ کتب کی کتنی بڑی تعداد مکتبہ کے ذریعے سے حاصل ہو جاتی ہے۔

تحقیق میں شامل اندراجات اور عکسی صفحات ایک ہی آپشن سے

یوں کہیے کہ اگر آپ کسی موضوع پر پی ڈی ایف (PDF) کتاب تیار کرنا چاہیں تو یہ کام ۱۰ سے ۳۰ منٹ پورا ہونے میں لے گا تقریبا ۳۰ منٹ میں آپ کی کتاب تیار اور نشر (Print) کے لیے دستیاب ہوگی۔

تلاش کے نتائج کی سہولت میں اضافہ

المکتبة الشاملة کی طرح اگلی تلاش کرنے پر گزشتہ تلاش کے نتائج ختم نہیں ہوں گے بلکہ اگلی تلاش کے ساتھ ساتھ پچھلی تلاش کی ونڈوز اپنے نتائج کے ساتھ باقی رہیں گی جب تک کہ ان کو بند نہ کر دیا جائے۔

وقت کی بچت

اگر آپ چند کتب کا مطالعہ کر رہے ہیں اور کمپیوٹر یا مکتبہ کسی وجہ سے بند کرنا چاہتے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ جب دوبارہ مکتبہ

کھولا جائے تو بند کرنے سے پہلے جو کتب کھلی ہوئی تھیں وہ تمام وہیں سے کھل جائیں تو اب یہ ممکن ہوگا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سہولت سے کتنا وقت اور فکر بچے گی، غالبا یہ سہولت المکتبۃ الشاملۃ میں موجود نہیں۔

ناشر سے کتاب کی تلاش

کتاب کی تلاش کے لیے پہلے کی طرح کتاب کے نام، مصنف کے نام اور زمرہ کے ساتھ ساتھ ناشر سے کتاب کو تلاش کرنے کی سہولت کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ایک وقت میں ایک سے زیادہ کتب کو کھولنا

ایک سے زیادہ کتب کو منتخب کر کے ایک وقت میں کھولا جا سکے گا۔ غالبا یہ سہولت المکتبہ الشاملہ میں موجود نہیں

مقصود کی تلاش میں سہولت

قرآن کی آیات، احادیث مبارکہ اور عربی عبارتوں کی تلاش بہت آسان ہو جائے گی، جیسے پہلے ذکر کیا گیا آپ اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ جو الفاظ آپکے ذہن میں موجود ہیں ان سے آپکو نتائج ملیں گے یا نہیں تو اس کا اندازہ آپ کو تلاش کے الفاظ داخل کرتے ہوئے ہی ہو جائے گا

شجرہ پر فلٹر کی سہولت

المکتبۃ الشاملۃ کی طرح کتاب اور کھلی ہوئی کتاب کے عناوین میں کسی خاص لفظ کو فلٹر کرنے کے لیے کتب کے شجرہ اور کتاب کی فہرست کے شجرہ پر فلٹر کا اضافہ کیا گیا ہے۔

تحقیق کو ورڈ میں ایکسپورٹ کے وقت عکسی صفحات کے سائز کا اختیار

تحقیق کو مائیکروسافٹ ورڈ میں ایکسپورٹ کرتے ہوئے اس بات کی تعیین ممکن ہوگی کہ عکسی صفحہ کا سائز کیا ہونا چاہیے

لغات سیکشن کا اضافہ

مکتبہ کے اندر ہی لغات کا سیکشن بنایا گیا ہے جس کی مدد سے لغت کی ضرورت کافی حد تک مکتبہ ہی میں پوری ہو جائے گی، یعنی قاموس الوحید، مصباح اللغات، المنجد وغیرہ اردو عربی اور عربی اردو لغات جو گولڈن ڈکشنری وغیرہ میں استعمال ہوتی رہی ہیں وہ اب مکتبہ جبریل میں ہی رہتے ہوئے استعمال کرنا ممکن ہوگا۔

کھلی ہوئی ونڈوز کو ایک ساتھ بند کرنا

ایک سے زیادہ کتب اور تلاش کی ونڈوز کو ایک وقت میں بند کرنا ممکن ہوگا تا کہ ایک ایک کر کے تمام ونڈوز کو بند نہ کرنا پڑے

مطلوبہ ونڈوز کو چھپانا اور ظاہر کرنا

مکتبہ کے شجرہ، کتاب کے عناوین کے شجرہ اور لغات والی ونڈوز کو چھپانا اور پھر اپنی مرضی سے ظاہر کرنا ممکن ہوگا کہ اگر پوری سکرین پر کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ممکن ہو سکے۔

مینیو بار (Menu Bar) کا اضافہ

نئے ورژن میں مینیو بار کا اضافہ کیا گیا ہے تا کہ ایک طرح کی سہولتوں کو ایک جگہ رکھنا اور تلاش کرنا آسان ہو

مکتبہ جبریل کی عام اشاعت

مکتبہ جبریل ورژن 2 کو انٹرنیٹ پر ڈاؤن لوڈ کے لیے فراہم کیا جا رہا ہے، لہٰذا یہ پہلا موقع ہے کہ مکتبہ کی آفیشل ویب سائٹ پر ڈاؤن لوڈ کے لیے عام موجود ہوگا۔

کی بورڈ شارٹ کٹس (keyboard shortcut keys)

کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپشنز کے لیے کی بورڈ شارٹ کٹس متعین کئے جائیں تا کہ سہولت اور تیزی سے کام کرنا ممکن ہو سکے۔

مکتبہ بند کرنے پر تصدیق

مکتبہ بند کرنے پر تصدیق لی جائے گی کہ کیا آپ واقعی مکتبہ بند کرنا چاہتے ہیں تا کہ حادثاتی طور پر مکتبہ کے بند ہونے پر کسی جاری کام کا نقصان نہ ہو۔

تحقیقات سے افادہ اور استفادہ

ایک اور اہم بات کوشش کی جائے گی کہ مکتبہ کی تحقیق کی سہولت سے جو تحقیقات بنائی جائیں ان کا دوسرے اہل علم کے ساتھ شیئر کرنے کا ایک جامع نظم ویب سائٹ پر بنایا جائے تا کہ ایک دوسرے کے مطالعہ، تحقیق سے استفادہ، اس کی تنقیح اور اس پر مفید اضافہ ممکن ہو سکے، یقیناً اگر اس نظم کو مئوثر طور پر قائم کیا جائے تو تحقیقی ذوق جو کہ ختم ہوتا جا رہا ہے اس کو دوبارہ سے بیدار کیا جا سکتا ہے اور اپنی تحقیقی محنت کو احسن انداز میں دوسروں کے سامنے پیش کرنا ممکن ہو سکے گا

Wildcards کا استعمال

ایک اور اہم چیز Wildcards کا استعمال کر سکنا ہے انڈیکس سرچ کے ساتھ Wildcards حقیقت میں علامات ہوتی ہیں یعنی ہم تلاش میں الفاظ کے ساتھ ان علامات کو جوڑتے ہیں خاص فوائد حاصل کرنے کے لیے, سب سے زیادہ فائدہ مند علامت * ہے، اگر آپ کسی لفظ کے آخر میں اس کو جوڑ دیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ یہ لفظ جس طرح بھی مکمل ہو اس کو تلاش کے نتائج میں شامل کیا جائے۔

پہلی مثال: روز*

اس طرح لکھنے پر یہ تمام الفاظ تلاش کے نتائج میں ظاہر ہوں گے، روزہ، روزے، روزوں، وغیرہ۔

دوسری مثال: خراب*

اس طرح لکھنے پر یہ تمام الفاظ تلاش کے نتائج میں ظاہر ہوں گے، خرابی، خرابیاں، خرابیوں، وغیرہ۔

ایک ہی تلاش میں ایک سے زیادہ الفاظ ان علامات پر مشتمل لکھے جا سکتے ہیں۔ مثال: روز *خراب*

مکتبہ کے اعداد و شمار

مکمل یونیکوڈ کتب: 1244	کل کتب کی تعداد: 3620
پی ڈی ایف مع فہرست: 1142	مصنفین کی تعداد: 525
صرف پی ڈی ایف: 1234	ناشرین کی تعداد: 256

مکتبہ جبریل اینڈ رائیڈ موبائل ورژن (Android Mobile Version)

عنقریب ان شاءاللہ مکتبہ جبریل اینڈ رائیڈ موبائل ورژن میں اپنی تمام تر سہولیات جو ونڈوز ورژن میں موجود ہے دستیاب ہوگا باقی تفصیل پڑھنے کے لیے مکتبہ جبریل کی ویب سائٹ پر جائیں یا اس کا فیس بک لنک بھی وزٹ کیا جا سکتا ہے۔

ویب سائٹ : http://www.elmedeen.com

فیس بک پیج : https://www.facebook.com/maktabajibreel

استعمال کا طریق کار جاننے کے لیے یوٹیوب چینل :

www.youtube.com/maktabajibreel

نوٹ: اِس پروجیکٹ میں معاون بنیں اگر آپ مصنف ہیں تو اپنی کتب ارسال کر کے (خصوصا یونیکوڈ یا ان پیج میں) اگر آئی ٹی سے جڑے ہوئے ہیں تو فنی خدمات پیش کر کے، ٹائپنگ پروجیکٹ میں حصہ لے کر، (اگر آپ اپنی زندگی میں سے ایک منٹ بھی فارغ کر سکتے ہیں تو آیئے! مستند دینی کتب کی آن لائن ٹائپنگ کیجیے آپ کا یہ ایک منٹ بھی آپ کے لیے عظیم صدقہ جاریہ اور ثواب کا باعث بن سکتا ہے)، اگر صاحبِ حیثیت ہیں تو مالی معاونت کر کے، تشہیر کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متوجہ کر کے، خصوصی دعاؤں اور توجہات میں یاد رکھ کر اِس نیکی کے کام میں حصہ لے سکتے ہیں اللہ تعالیٰ علم دین ٹیم اور تمام معاونین کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور اس کاوش کو پوری امت اور انسانیت کے لئے نافع بنائے (امین)

حضرت مولانا عبدالرؤف بادشاہ
مدیر مسئول

عفوودرگزر اتفاق واتحاد کے لیے اہم ضرورت

عفوودرگزر اخلاق حسنہ میں سے ایسا عظیم خلق وصفت ہے کہ اسلام میں یہ مطلوب بھی ہے اوراس پر بہت سے فضلیت وارد بھی ہوئی ہے، عفوودرگزر ایک ایسا عالی صفت ہے کہ ایک پرامن اورمحبت وبھائی چارے والے معاشرہ میں اس کی حیثیت جزء لاینفک ہے، کفر وشرک کے بعد کبیرہ گناہ میں سے قتل مؤمن ایک کبیرہ گناہ ہے اوراللہ تعالیٰ نے قتل مؤمن کے بارے میں جہنم، اللہ تعالیٰ کا غضب، لعنت اورعذاب عظیم کا وعیدارشادفرمایاہے، لیکن دوسرے طرف مقتول کی طرف سے قاتل کومعاف کرنے پربھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم فضیلت آئی ہوئی ہے اورکبھی کبھارایک معمولی سی غلطی، لغزش کی تلافی نہ ہونے سے بہت زیادہ فساد حتی کہ قتل وغارت تک نوبت آجاتی ہے اس لیے اس مضمون میں عفوودرگزر کے فوائد، فضلیت اوراہمیت کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اخلاص اورعمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

عفوکا معنی ومفہوم: عفوعربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی معاف کرنا، بخش دینا، درگذر کرنا، بدلہ نہ لینا اورگناہ پر پردہ ڈالنے کے ہیں، عام طور پر ع، ف اور و کا مادہ کسی چیز کے چھوڑنے پر دلالت کرتا ہے، اصطلاح شریعت میں عفو سے مراد کسی کی زیادتی وبرائی پر انتقام کی قدرت وطاقت کے باوجود انتقام نہ لینا اورمعاف کردیناہے، امام قرطبیؒ نے عفو کی تعریف کی ہے ترك المؤاخذة بالذنب (۱) کسی کی غلطی پراس کی پکڑ نہ کرنا، علامہ کفوی رحمۃ اللہ علیہ نے عفو کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے كف الضرر مع قدرة عليه (۲) قدرت کے باوجود کسی کو تکلیف نہ دینا۔

عفو کے ساتھ ایک دوسرا لفظ الصفح بھی استعمال ہوتا ہے بعض علماء کے ہاں عفواورصفح ایک چیز ہے لیکن محققین کے ہاں ان دونوں لفظوں میں فرق ہے چنانچہ امام قرطبیؒ سورۃ بقرہ کے آیت نمبر ۱۰۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں العفو ترك المؤاخذة بالذنب (۳) یعنی کسی کی غلطی پراس کو سزا نہ دینا اور الصفح ازالة اثره من نفس دل سے کراہت کو ختم کردینا امام قرطبیؒ کے اس عبارت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ عضواورصفح دونوں الگ الگ چیزیں ہیں یعنی مجرم کو معاف کرنا عفو ہے اوراس کے لیے دل کو مکمل صاف کرنا صفح ہے۔

اہمیت: عفواورتسامح انسانی اخلاق میں ایک بنیادی صفت ہے، رب کریم نے قرآن مجید میں بار بار اسی صفت کا تذکرہ تاکید سے ارشادفرمایاہے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

فَاعفُوا وَاصفَحُوا حَتَّى يَأتِيَ اللَّهُ بِأَمرِهِ (٤)

چنانچہ تم معاف کرواور درگزر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود اپنا فیصلہ بھیج دے

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

فَاعفُ عَنهُم وَاستَغفِر لَهُم(٥)

لہٰذا ان کو معاف کردو ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔

اللہ تعالیٰ نے عفو کرنے والوں کے ساتھ جنت کا وعدہ کیا ہے ارشاد خداوندی ہے

وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ 0 الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ(٦)

اور اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو اور بہشت کی طرف جس کا عرض آسمان اور زمین ہے جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خوشی اور تکلیف میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عظیم اجر اور بہت بڑی عطاء کا تذکرہ کیا ہے عفو کرنے والو کا اجر اللہ تعالیٰ کبھی ضائع نہیں کرتے، رب کریم کا ارشاد ہے

فَمَن عَفَا وَأَصلَحَ فَأَجرُهُ عَلَى اللَّه (٧)

پس جس نے معاف کر دیا اور صلح کر لی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کا اجر ضائع نہیں کرینگے بحوالہ ابن کثیر۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ما زاد اللہ عبدا بعفو إلا عزا(٨) عفو کے ساتھ اللہ تعالیٰ بندہ کی عزت میں اضافہ فرمادیتے ہے، عفو اور درگزر پر اس قدر زیادہ ثواب اور انعامات ملنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے معاشرے پر بڑے دورس نتائج مرتب ہوتے ہیں، عفو کی وجہ دل صاف ہوجاتا ہے، آپس میں محبت بڑھتی ہے، اختلافات ختم ہوجاتے ہیں سخت سے سخت دل عفو کی وجہ سے نرم ہوجاتا ہے۔

اسی طرح عفو نہ کرنے سے کبھی کبھار قطع رحمی وعداوت پیدا ہوجاتی ہے، جس پر احادیث مبارکہ میں سخت وعیدات وارد ہوئی ہے حدیث مبارک میں ہے کہ نصف شعبان کو اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کی مغفرت فرماتے ہیں سوائے چند لوگوں کے جن میں سے ایک قطع رحمی کرنے والا بھی ہے

أَتَانِي جِبرِيلُ عَلَيهِ السَّلَامُ فَقَالَ: هَذِهِ اللَّيلَةُ لَيلَةُ النِّصفِ مِن شَعبَانَ وَلِلَّهِ فِيهَا عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ بِعَدَدِ شُعُورِ غَنَمِ كَلبٍ لَا يَنظُرُ اللهُ فِيهَا إِلَى مُشرِكٍ وَلَا إِلَى مُشَاحِنٍ وَلَا إِلَى قَاطِعِ رَحِمٍ وَلَا إِلَى مُسبِلٍ وَلَا إِلَى عَاقٍّ لِوَالِدَيهِ وَلَا إِلَى مُدمِنِ خَمرٍ(٩)

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا) جبرئیل علیہ السلام میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ شعبان کی پندرہویں رات ہے، اللہ تعالیٰ اس رات میں بہت سے لوگوں کو دوزخ سے آزاد کرتا ہے، جن کی تعداد قبیلہ کلب کی

بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے مگر اس رات میں اللہ تعالی مشرک، اور کینہ ور، اور رشتے ناطے توڑنے والے (یعنی قطع تعلقی کرنے والے) اور ازار (یعنی پاجامہ، شلوار وغیرہ) ٹخنوں سے نیچے رکھنے والے (لوگوں) اور ماں باپ کے نافرمان اور شراب کے عادی لوگوں کی طرف رحمت کی نظر نہیں فرماتے۔

اس طرح عفو کرنے کے ساتھ صلہ رحمی بھی قائم رہتی ہے صلہ رحمی پانے والے کے لیے احادیث مبارکہ میں بہت زیادہ فضلیت آئی ہے، ایک حدیث میں ہے

عن عائشة قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الرحم معلقة بالعرش تقول من وصلنى وصله الله ومن قطعنى قطعه الله(۱۰)

رشتہ عرش الٰہی سے آویزاں ہے، وہ پکار پکار کر کہتا ہے جس نے مجھے جوڑا اللہ اسے جوڑے اور جس نے مجھے توڑ دیا، اللہ اسے توڑ دے۔

اس طرح صلہ رحمی کرنے والے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صلہ رحمی کرنا عمر میں اضافہ اور رزق میں کشادگی کا ذریعہ ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أحب أن يبسط له فى رزقه وينسأ له فى أثره فليصل رحمه(۱۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو چاہتا ہو کہ اس کی روزی میں کشادگی ہو اور اس کی عمر میں اضافہ ہو تو اسے اپنے رشتے داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا چاہیے

عفو و درگزر کے مواقع

انسانوں کے درمیان عفو و درگزر کے متعدد مواقع ہیں، ان میں سب سے پہلا اور اہم اپنے بھائیوں کے درمیان ہے، بھائیوں کے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ رہنے کی وجہ سے غلطیوں کا امکان زیادہ رہتا ہے اس لیے قرآن مجید نے یوسف علیہ السلام اور ان بھائیوں کا تذکرہ بڑے اہتمام سے کیا ہے، یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینک دیا

وَ اَجۡمَعُوۡۤا اَنۡ یَّجۡعَلُوۡہُ فِیۡ غَیٰبَتِ الۡجُبِّ (۱۲)

اور انہوں نے یہ طے کر ہی رکھا تھا کہ انہیں ایک اندھے کنویں میں ڈال دیں گے

اس پر چوری الزام لگایا

قَالُوۡۤا اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنۡ قَبۡلُ(۱۳)

وہ بھائی بولے کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کا ایک بھائی اس سے پہلے بھی چوری کر چکا ہے،

لیکن ان تمام غلطیوں اور عداوتوں کا ازالہ یوسف علیہ السلام کے اس ایک جملہ سے ہو گیا

قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ(١٤)

آج تم پر کوئی ملامت نہیں

بلکہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مزید احسان کرتے ہوئے ان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی

يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ(١٥)

اللہ تمہیں معاف کرے وہ سارے رحم کرنے والوں میں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے،

اسی طرح کوئی بھائی اپنے بھائی یا بہن کی طرف عفو و درگزر کا ہاتھ بڑھائیں اور ایک گھر کے افراد آپس میں اس طرح معافی تلافی کے ساتھ زندگی گزاریں تو کس قدر عظیم الشان معاشرہ وجود میں آجائے گا۔

دوسرا موقع زوجین کے درمیان عفو و درگزر کی صورت ہے، زوجین کے درمیان عفو و درگزر شرعاً مطلوب بھی ہے اور پسندیدہ بھی اللہ تعالیٰ نے شوہر کو اپنے بیویوں کے ساتھ عفو کا معاملہ برتنے کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے

وَإِن تَعفُوا وَتَصفَحُوا وَتَغفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ(١٦)

اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور بخشش دو تو اللہ بہت بخشنے والا بہت مہربان ہے۔

بیوی کو شوہر کی محبت اور اس کی طرف سے کیے ہوئے احسان کا معاملہ یاد دلانے کی متعلق ارشاد فرماتے ہے

وَلَا تَنسَوُا الفَضلَ بَينَكُم (١٧) اور آپس میں احسان کرنا نہ بھولو

اگر میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح عفو والا معاملہ کرتے رہیں تو ان کی زندگی ایک مثالی زندگی بن جائے گی اور آپس کی نفرت محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔

تیسری صورت اپنے رشتہ دار، پڑوسی، ساتھیوں اور معاشرہ کے دوسرے افراد کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ ہے، شریعت اسلامی نے ہر فرد کے ساتھ عفو اور درگزر کے ترغیب دی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

ادفَع بِالَّتِي هِيَ أَحسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَينَكَ وَبَينَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (١٨)

دفعیہ اس بات سے کیجئے جو اچھی ہو پھر نا گہاں وہ شخص جو تیرے اور اس کے درمیان دشمنی تھی ایسا ہوگا گویا کہ وہ مخلص دوست ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان فرماتی ہے

لا یجزی بالسیئة السیئة ولکن یعفو اویصفح (١٩)

آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معاف فرماتے تھے اور درگزر کرتے تھے۔

مشرکین مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی، ذاتی اور خاندانی تکلیف دی، اس وطن سے نکال دیا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تھی، لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر ان پر غالب ہو کر مکہ میں داخل ہو گئے، تو ان تمام کے ساتھ کریم بھائی کی طرح معاملہ فرمایا، یہاں تک ان کی زبانیں پکار اٹھی اخٌ کریم وابن اخ کریم اور یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنے لگے۔

الغرض عفو و درگذر ایسا بلند اور عظیم وصف ہے کہ جو دین کے تمام جوانب میں مطلوب و مقصود ہے، چاہے اس کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات اور روزمرہ کے امور سے، یا پھر لین دین، قرض اور خرید و فروخت سے متعلقہ امور سے ان کی نسبت ہو، اسی طرح زندگی کے تمام شعبوں میں ہر طبقہ کے لوگوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے بھی عفو و درگزر کو مدنظر رکھا جائے اور بلا استثناء ہر کسی کے ساتھ درگذر والا معاملہ کیا جائے، افرادِ معاشرہ میں والدین سب سے زیادہ ہمارے اس اخلاق کے مستحق ہیں، ان کے بعد بیوی، بچے، اہل و عیال، ہمسائے، دوست احباب اور تمام لوگ ہمارے عفو و درگذر کے حق دار ہیں، انسان کو چاہیے کہ اللہ تعالی سے معاملہ کرتے ہوئے اور تمام لوگوں سے معاملات نمٹاتے ہوئے اس عظیم خوبی سے کام لے، اور اس کی زندگی عفو و درگزر اور رواداری جیسے اوصافِ حمیدہ پر قائم ہونی چاہیے۔

مصادر و مراجع

(۱) القرطبی ج۲، ص۷۱ (۲) الکلیات ص۵۳

(۳) القرطبی ج۲، ص ۷۱ (٤) البقرہ :۱۰۹

(٥) آل عمران ۱۵۹ (٦) آل عمران : ۱۳۳، ۱۳٤

(۷) الشوریٰ : ٤۰ (۸) مسلم شریف: ح۲۵۸۸

(۹) شعب الایمان ج٥، ص ۳٦۳ (۱۰) مسلم شریف : ح۲٥٥٥

(۱۱) بخاری شریف: ح٥۹۸٦ (۱۲) یوسف:۱٥

(۱۳) یوسف:۷۷ (۱٤) یوسف:۹۲

(۱٥) یوسف:۹۲ (۱٦) التغابن ۱٤

(۱۷) البقرہ ۲۳۷ (۱۸) (فصلت ۳٤) (۱۹) ترمذی ۲۰۱٦

مولانا محمد اسلام حقانی
معاون مدیر

غریبوں کی بے بسی امیروں کی بے حسی
میدان معیشت میں سنت نبویؐ پر عمل کی ضرورت

اسلام کی عظیم الشان تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ نہ صرف مال اللہ کی راہ میں کثرت سے خرچ کیا جائے بلکہ ان تنگ دست لوگوں کو تلاش کیا جائے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مدد کا خاص مستحق قرار دیا ہے، وہ غیرت مند لوگ کہ نہ ان کی آنکھ اٹھتی ہے، نہ ان کے ہاتھ اٹھتے ہے، نہ ان کی زبان کھلتی ہے، نہ ان کی ہونٹ ہلتے ہے، جن کے چہرے استغناء کے نور سے جمگاتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ضرورت مند نہیں ہے حالانکہ یہی لوگ اصل انفاق کے مستحق ہیں۔

عالم اسلام خصوصاً پاکستان اور پاکستان کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر شہروں میں خودکشی کی وارداتوں میں مسلسل اضافے کی خبریں خطرے کی آخری حد تک کو عبور کر چکی ہیں مگر ہماری حکومتیں، خوشحال طبقات اور دیندار لوگوں نے ابھی تک اس مسئلے کی سنگینی پر سنجیدگی سے توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کی، مملکت خداد پاکستان کے چپہ چپہ میں غربت کی شرح بے پناہ ہوجانے کے باعث خودکشی کی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور روازنہ کئی افراد کے خود کو ہلاک کر لینے کی اطلاعات، اخبارات، ٹی وی چینل، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا میں شائع ہورہی ہیں، اس طرح کے واردات اس صوبہ میں بکثرت رونما ہورہے ہیں جس کے بارے میں ہمارے عمومی رجحان یہ ہے کہ یہ صوبہ پورے ملک کو لوٹ رہا ہے، ملک کے ذرائع معیشت پر قابض ہو چکا ہے اور اس صوبے کا ہر فرد ظالم اور استحصالی ہے، غربت کی ایسی ایسی کہانیاں اخبارات اور تمام ذرائع ابلاغ میں میں شائع ہورہی ہیں کہ انہیں پڑھ کر بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں مگر اس کے باوجود معاشرے پر عمومی بے حسی طاری ہے اور غربت کو ختم کرنے اور خودکشی کی بڑھتی ہوئی وراداتوں کو کم کرنے کے لیے ریاست سے لے کر معاشرے کی سطح تک کسی جگہ سے کوئی توانا یا ناتواں آواز بھی آج تک نہیں اٹھی، اس مجرمانہ وسفاکانہ بے دردی، بے نیازی، غیر ذمہ داری کو کیا نام دیا جائے؟

غریب کی خودکشی پر نادم کوئی نہیں

یہ حالات آج کے نہیں بلکہ کئی عشروں سے جاری وساری ہے، کئی سال پہلے تین معصوم بچیوں نے اس لیے خودکشی کر لی تھی کہ

وہ چار دن سے بھوکی تھیں، باپ سے کہا کہ سامنے کھیت سے گاجر توڑ لائے، وہ باہر نکلا مگر غیرت مند باپ کے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ بغیر اجازت کھیت سے گاجر توڑے، کچھ دیر بے تابی سے باہر ٹہلتا رہا خالی ہاتھ واپس لوٹا تو اس کی گود بھی ہمیشہ کے لیے خالی ہو چکی تھی تینوں بچیوں نے خودکشی کر لی تھی اور اس بستی میں کوئی ایسا کاندھا نہیں تھا جس پر سر رکھ کر وہ رو سکتا اور اپنا درد دل بیان کر سکتا، اسی طرح کئی سال پہلے ایک بے بس ولاچار شخص سے اس کے بچوں نے صرف یہ پوچھا تھا کہ بابا! کیا اس مرتبہ بھی عید پر ہمارے کپڑے نہیں بنیں گے؟ جب باپ کی جلی ہوئی لاش واپس آئی تو بچے بین کر رہے تھے کہ بابا! ہمیں عید کپڑے نہیں چاہیے، آپ آنکھیں کھولیے! ہم اب کبھی عید پر کپڑے نہیں پہنیں گے مگر کیا اب ان بچوں کی زندگی میں کوئی عید بھی ہوگی؟ انہیں اب کوئی خوشی بھی میسر آ سکے گی؟

اسی طرح کچھ عرصہ قبل خودکشی کے دو دل دہلا دینے والے واقعات بھی اس بے حس معاشرے میں ہلچل کا باعث نہ بن سکے کہ ایک شخص معاشی بدحالی اور بے روزگاری کے باعث خود کو پھانسی لگا کر ہلاک ہونے پر مجبور ہو گیا، ہلاک ہونے والا شخص اپنے جھگی نما گھر میں ایک نیم پاگل بھائی، والدہ اور نابینا والد کے ہمراہ رہتا تھا، غربت و افلاس کے ستائے ہوئے اس خاندان نے چار روز سے فاقہ کر رکھا تھا، یہ شخص کچھ عرصہ سے بے روزگار بھی تھا، فاقوں سے تنگ آ کر ایک شب اپنے کسی جاننے والے سے چند پیسے مانگ کر ہوٹل سے ایک روٹی خرید کر لایا اور اس ایک روٹی میں نابینا والد، ضعیف والدہ اور نیم پاگل بھائی کو کھلایا اور خود کو پھندا لگا کر ہلاک کر لیا، ضعیف والدہ نے جوان بیٹے کی لاش لٹکتے دیکھی تو دیوانہ وار چلانے لگی، شور و غل سن کر اہل محلّہ جمع ہوئے لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اپنے پڑوسی کی بھوک کے مارے خودکشی پر نادم ہو، اسی طرح ایک اور بے بس اور لاچار شخص نے بھی معاشی، بدحالی اور بے روزگاری سے تنگ آ کر خود پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی تھی، شخص موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا، ہلاک ہونے والا شخص ۹ بچوں کا باپ تھا، بچوں کی فرمائش، بے روزگاری کے باعث پوری نہ کر سکا، اور خود کو جلا کر ہلاک کر لیا۔

غربت اور عزت نفس

درد و غم میں ڈوبے ہوئے ایسے واقعات بکثرت رونما ہوئیں اور رونما ہو رہے ہیں اور یہ سلسلہ رکنے کا نام نہیں لیتا، جن میں سے کچھ اخبارات کے زینت بنے اور کچھ لوگوں کی ذاتی مشاہدات میں آئے اسی طرح کا ایک واقعہ ایک صاحب نے کے مشاہدے میں آیا وہ کہتے ہیں کہ میں سگریٹ کی تلاش میں نکلا تو ایک بچہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رو رہا تھا، تتلاتے ہوئے، ٹوٹے پھوٹے جملوں میں بتایا کہ رات سے بھوکا ہوں، اماں صبح یہاں لے آئی تھی، ابھی تک روٹی نہیں ملی، بھوک لگی رہی ہے اور اماں مجھے چھوڑ کر کسی کے ساتھ کسی کی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں چلی گئی ہے، یہ واقعہ ہر پتھر دل کو رلا دینے کے لیے کافی ہے، جب ایک ماں اپنی عزت بیچ کر اپنے معصوم بیٹے سے محبت کا حق ادا کرنے کے لیے روٹی کے چند ٹکڑے جمع کرنے کسی اجنبی کے ساتھ چلی جائے اور معصوم بچے کو کوئی سنبھالنے والا بھی نہ ہو، جب یہ معصوم بچہ کل بڑا ہوگا، تو اس کا ذہن اور ضمیر اس معاشرے کو جلا دینے کے لیے کیا کچھ نہ کرے گا؟

ترقی یافتہ شہروں میں بڑھتی ہوئی غربت کی حالت غیر

ترقی یافتہ شہروں میں بے روزگاری سے تنگ آئے ہوئے ایسے نوجوان بھی گلیوں میں مل جاتے ہیں جو آٹے کی ایک تھیلی کے عوض اپنی عزت گنوادینے پر آمادہ ہیں، جب وہ آنکھ میں آنسو لیے ہوئے اپنی حاجت لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں، تو آسمان پر اللہ تعالیٰ کا غیظ وغضب کس حال میں ہوگا؟ اس کا اندازہ صرف وہی کرسکتا ہے جس کے دل میں ایمان کی کوئی چنگاری باقی رہ گئی ہو، غربت کی شدت نے چھوٹے چھوٹے گھروں میں ساس بہو کے جھگڑوں میں بھی بے پناہ شدت پیدا کردی ہے، غربت دور کرنے کا آسان ترین نسخہ اب بہو کے ساتھ آنے والا مال اور جہیز ہے، کم جہیز لانے والی لڑکیوں کو یا تو ماردیا جاتا ہے یا زندہ جلا دیا جاتا ہے، چولہا پھٹنے سے سالانہ ہزاروں بہوئیں مررہی ہیں اب چولہا بھی متعصب ہوگیا ہے، وہ صرف بہو کے لیے پھٹتا ہے مگر کبھی گھر میں رہنے والی نند اور ساس کو گزند نہیں پہنچاتا، ایک گھر کی بہو کو کم جہیز لانے پر جلا دیا جاتا ہے، اس کی ماں لوگوں سے پوچھتی ہے کہ بیٹھی ہوئی تین بیٹیوں کی شادیاں کیسے کروں؟ جہیز تو میں ان کو بھی نہیں دی سکتی ایسی شادی کا کیا فائدہ؟ جس کے انجام سے باخبر ہوں کہ میری بیٹی کو کسی نہ کسی بہانے ماردیا جائے گا یا وہ خودکشی کرلے گی، لڑکیوں کو صرف اس جرم میں جلا دیا جاتا ہے، کہ وہ خالی ہاتھ رخصت کیوں ہوئیں؟ لڑکیاں کم جہیز لانے کی پاداش میں ظلم سے تنگ آکر خودکشی پر مجبور ہوتی ہے، بہت سی لڑکیوں کو طلاقیں دی جارہی ہے، کیا مائیں ڈاکہ ڈال کر جہیز لائیں یا لڑکیوں کو بے موت ماردیں؟

پسے ہوئے طبقات کی بے بسی

یہ کیسا ملک ہے، یہ کیسی تہذیب ہے، یہ کیسی معیشت اور کیسی معاشرت ہے کہ انسان کو درندہ بننے پر مجبور کردیا گیا ہے؟ مجبوری کی انتہاء یہ ہے کہ بعض خواتین اینٹیں بناتی ہے لیکن اسے اپنا کچا گھر نصیب نہیں، بعض خواتین سرکاری نوکری کرتی ہے لیکن اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلا سکتے اور بعض خواتین کھلونوں کی فیکٹریوں میں کام کرتی ہے مگر اس کے بچوں کو کھیلنے کے لیے کھلونے میسر نہیں، بعض بچوں کے کپڑے سیتا ہے لیکن اپنے بچوں کا تن ڈھانپ نہیں سکتا، بعض خواتین دوا ساز کمپنی میں کام کرتی ہے مگر خود اپنے علاج کے لیے دوا نہیں خرید سکتی، اور بعض لوگ گورکن ہے مگر اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ وہ اپنے باپ کے لیے کسی قریبی قبرستان میں قبر خرید سکے، زندگی تو دشوار تھی اب مرنا بھی مشکل ہوگیا ہے، بھیک مانگنے والے کا خودکشی کرنے کو دل چاہتا ہے مگر زہر خریدنے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔

یہ واقعات افسانے اور کہانیاں نہیں زندہ حقیقتیں ہیں، ملک کے طول وعرض میں، دریا دریا، ساحل ساحل، بستی بستی، گاؤں گاؤں، غربت کے نتیجے میں جنم لینے والی اذیت ناک اور دردناک کہانیاں عام ہیں مگر انہیں سننے والے کان، دیکھنے والی آنکھیں اور محسوس کرنے والے دل نایاب ہوچکے ہیں اور غریبوں کے سر پر دست شفقت رکھنے والا کوئی گروہ اس معاشرے کو میسر نہیں ہے۔

نظم معیشت کی بنیاد

خاتم المعصومین رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ اس امت کو پاکیزگی عطا نہیں کرتا جو اپنے اندر کے کمزور آدمی کے لیے اس کا حق نہیں نکالتی، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مختصر ترین حکم میں نظم معیشت کی بنیاد بیان کر دی گئی ہے لہٰذا ہر وہ نظام معیشت، معاشرہ، نظم ریاست اور اجتماعی بندوبست جو معاشرے کے کچلے ہوئے اور پسے ہوئے طبقات کو اٹھانے، انہیں بلندی بلکہ سر بلند کرنے کے بجائے انہیں مزید کچلنے، دبانے اور مٹا دینے کی روش اختیار کرے، قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ایک بد اصل، بد کردار، ظالم، متکبر اور شر انگیز معاشرہ و نظام ہے اور ایسے نظام کو مٹا دینا اور اس کے کھنڈرات پر ایک منصفانہ نظام کی بنیاد رکھنا لازمی تمدنی تقاضا بن جاتا ہے، بنی اسرائیل کے قصص اس مؤقف کے دینی پہلو کو سورج کی طرح روشن کرنے کے لیے کافی ہیں، ایک اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو محرومی کی حالت میں مبتلا نہ رہنے دے اور جو کوئی اس حالت میں ہو، اسے سہارا دے کر نکالے، قرآن نے وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۱) کہہ کر امراء کے مال میں سائل و محروم کے حق کی طرف توجہ دلائی ہے اسی لیے جب تک لوگوں میں حالت محرومی باقی رہے گی، امراء کے اموال میں ان کا یہ لازمی حق باقی رہے گا یہ حق اگر امراء بخوشی ادا کر دیں تو سب سے بہتر ورنہ حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ یہ حق طاقت کے ذریعے چھین کر سائل تک منتقل کر دے، کیا ریاست اس ضمن میں کوئی قانون سازی کر سکتی ہے؟ کیا امراء اور اغنیاء کے مال میں غرباء کا لازمی حصہ سوائے زکوۃ کے کچھ اور نہیں ہے؟ اور زکوۃ کے سوا تمام مالی ذمہ داریاں دراصل اخلاقی ذمہ داریوں کے زمرے میں آتی ہیں تو پھر ایسے مالی حقوق کا حصول کیسے ممکن ہو؟

فساد فی الارض کیا ہے؟

قرآن کریم نے مخلوق پر مال کے ذریعے احسان نہ کرنے، مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے، مال کے ذریعے آخرت میں گھر بنانے کی فکر نہ کرنے اور مال کو عیال اللہ (اللہ کی مخلوق پر) خرچ نہ کرنے کے رویوں کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا ہے، یہ محاربت حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بدترین خلاف ورزی ہے اور قرآن کریم کی نظر میں اس کی کم از کم سزا جلاوطنی، ایک بازو ایک ہاتھ کا ٹنا، سولی پر چڑھانا یا ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دینا ہے إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسعَونَ فِي الأَرضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَو يُصَلَّبُوا أَو تُقَطَّعَ أَيدِيهِم وَأَرجُلُهُم مِن خِلَافٍ أَو يُنفَوا مِنَ الأَرضِ ذَلِكَ لَهُم خِزيٌ فِي الدُّنيَا وَلَهُم فِي الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲)

وہ سرمایہ دار، دولت مند، خوشحال مسلمان اور وہ خوشحال مستبصرین ریاست و حکومت یا وہ خوشحال نظم معیشت جو انفال، انفاق، صدقہ، خیرات، غرباء کی دستگیری، مسکینوں کی مدد سے انکار کر دے قرآن کریم کی اصطلاح میں وہ مترفین، مفسدین، مجرمین، ظالمین، متکبرین، کافرین، مسرفین، مستبصرین کا گروہ ہے، اور فساد فی الارض کے جرائم کا مرتکب ہے لہٰذا قرآن و سنت کی نظر میں واجب القتل ہے۔

مترفین کے متعلق بعض علماء کا نقطہ نظر

امام احمد بن حنبلؒ، ابوبکر جصاصؒ، داؤد ظاہریؒ، ابن حزمؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسے بے شمار فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ بھوکے، پیاسے کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اگر اُسے بھوک پیاس کے سبب اپنی جان جانے کا اندیشہ ہو تو وہ کھانا یا پانی رکھنے والے سے جنگ کر سکتا ہے، اگر اس کشمکش میں بھوکا قتل کیا جائے تو اس کا قصاص لیا جائے گا اور اگر بھوکا اسے قتل کر دے تو اس پر نہ دیت لازم ہے اور نہ اخروی عذاب ہوگا، اس استدلال کی بنیاد فقہاء کے ہاں سورۃ حجرات کی درج ذیل آیت ہیں۔

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ(۳)

اگر تم میں کوئی گروہ دوسرے پر زیادتی وظلم کرے تو اس باغی سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کے آگے جھک جائے

قارون بنی اسرائیل کا فرد، ایک مسلمان اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا مگر اس نے اپنے مال کو خلق کے لیے خرچ کرنے سے انکار کر دیا، خالق کا مال مخلوق پر خرچ کرنے سے انکار فساد فی الارض تھا لہٰذا اسے اس جرم کی پاداش میں زمین میں دھنسا دیا۔

سفید پوش ڈاکوؤں کی چالبازیاں

محروم، سائل محتاج، غریب، مسکین، فقیر، نادار کا حق روکنے والی ریاست، معاشرہ، فرد، گروہ، سرمایہ دار، جاگیردار، صنعت کار، دراصل مترفین، مجرمین، مفسدین، ظالمین، متکبرین، مسرفین، مستبصرین کا گروہ بن جاتا ہے جو مستضعفین کے گروہ کے خلاف محاربت اور اقتصادی دہشت گردی کا مرتکب ہوتا ہے، جس کے خلاف جدوجہد لازمی ہو جاتی ہے، تمام فقہاء محاربہ میں سب سے پہلے ڈاکو کو لیتے ہیں جو ڈاکے ڈال کر لوگوں کی جان و مال اور اس زمین کے نظم ونسق کے لیے خطرہ کا باعث بنتے ہیں، لہٰذا جو ڈاکو کسی ملک کی معیشت، اس کے وسائل اقتصاد اور اس کے ذرائع رسک پر مسلسل ڈاکے ڈال رہے ہیں اور عیاشی فضول خرچی، اسراف، بخل، کنز کے ساتھ ساتھ ایسے مال و دولت سے اپنے خدام ملازمین اور نوکروں کو بھی نفع پہنچانے کے لیے آمادہ نہیں اور جن کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ نے شریفانہ معاشرت کے لیے سنگین نوعیت کے مجرمانہ خطرات پیدا کر دیے ہیں، آیت محاربہ کے تحت واجب القتل ہیں، یہ سفید پوش ڈاکو جو عالی شان بنگلوں میں رہتے ہیں، عالی شان کاروں میں گھومتے ہیں، جن کے بچے بیرون ملک تعلیم حاصل کرتے ہیں، جن کے گھر کا روزانہ خرچ ان کے ایک خادم کی کئی سال کے تنخواہ کے برابر ہے، جن کے لیے پینے کا پانی بیرون ملک سے آتا ہے، غسال کابل سے، اور کفن جاپان سے منگوایا جاتا ہے، ان سفید پوش ڈاکوؤں نے بینکوں سے اربوں روپے کے قرض ہضم کر لیے اور ملک کی معیشت کو اپنی چالبازیوں سے عالمی ساہوکاروں کے پاس گروی رکھ دیا ہے، ان سے کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں برتی جا سکتی۔

مخلوق خدا کو مشقت میں مبتلا کرنے والوں کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا

ہر وہ حکومت اور معاشرہ جو مخلوق خدا کو مشقت، تکلیف، مشکل اور آزمائش میں مبتلا کرے ایک بداصل کافر، فاسق، ظالم

اور جابر حکومت ہے، ایسے حکام کے لیے خاتم المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے دعا فرماتے ہوئے کہا کہ! اے اللہ؟ ان حاکموں کو بھی ویسی ہی تنگی اور مشقت میں ڈال، جس میں انہوں نے مخلوق کو ڈالا ہے'' مہنگائی، بے روزگاری، غربت و بے کاری اور خودکشی کے لرزہ خیز واقعات میں اضافہ ایسے ظالم حکمرانوں کی بے حسی کے منطقی نتائج ہوتے ہیں، دردمندی اور دلسوزی سے محروم حکمران عوام کے لیے باعث وبال بن جاتے ہیں۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا اثر

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کا اثر تھا کہ خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور ان کے بعد بھی خلافت بنوامیہ سے لے کر خلافت عثمانیہ تک کم وبیش تمام خلفاء نے مخلوق خدا کی فلاح و بہبود کو عموماً مقدم رکھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اقتدار اور جمہور کے درمیان حائل تمام فاصلے اپنے طرز عمل سے مٹا کر رکھ دیے تھے، ایک دفعہ ایک صحابی نے فتح آذربائیجان کی خوشی میں مٹھائی کے دوٹوکرے حضرت عمرؓ کو مدینہ منورہ بھیجے، مگر انہوں نے اس بناء پر اس کو قبول نہ کیا کہ ہم ایسی کوئی چیز نہیں کھاتے جو تمام مسلمانوں کے گھروں میں کافی مقدار میں موجود نہ ہو، ایک بار حضرت عمرؓ نے فرمایا میں سب سے برا حاکم ہونگا، اگر اچھا تو میں کھاؤں مگر لوگوں کو خراب غذا کھلاؤں، قحط کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے گوشت وروغن اور اچھی روٹی کا استعمال ترک کر دیا، یہاں تک کہ چہرے کی رنگت سیاہ ہوگئی، حضرت ابوعبیدۃ بن الجراحؓ نے ایرانی عہدیداروں کی ضیافت کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابوعبیدہؓ وہی چیزیں کھا سکتا ہے جو سب مسلمانوں کے کھانے کے لیے میسر آئیں، جب تک حکمرانوں کا رویہ اس سانچے سے ڈھل کر نہ نکلے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے تیار کیا ہے، عالم اسلام خصوصاً پاکستانی معاشرے سے غربت کے خاتمے کا دور دور تک امکان نہیں۔

انفاق مال قرآن کی روشنی میں

قرآن کریم تزکیہ نفس، شب بیداری (تہجد) تلاوت قرآن، فکر آخرت، موت کی یاد، انصاف اور خدا ترسی کی نصیحت کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ نماز تہجد کو نفل قرار دیا ہے، لیکن مال خرچ کرنے کو فرض قرار دیتا ہے کیونکہ انسان سب سے زیادہ محبت مال سے رکھتا ہے جو اسے دنیا سے قریب تر کرتی ہے اور آخرت سے دور تر کر دیتی ہے اس لیے قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے

يَايهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ(٤)

اے لوگو! تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے

بندوں سے غافل ہونا دراصل اللہ سے غافل ہونا ہے، کیونکہ بندے اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہیں اور جو اللہ کے گھر والوں سے غافل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس سے غافل ہو جاتا ہے، اس لیے حدیث شریف میں آیا ہے،

عن أبی هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله عز وجل يقول يوم القيامة: يا ابن آدم

مرضت فلم تعدنی قال: یا رب کیف أعودك وأنت رب العالمین قال: أما علمت أن عبدی فلانا مرض فلم تعده أما علمت أنك لو عدته لوجدتنی عنده یا ابن آدم استطعمتك فلم تطعمنی قال: یا رب وکیف أطعمك وأنت رب العالمین قال: أما علمت أنه استطعمك عبدی فلان فلم تطعمه أما علمت أنك لو أطعمته لوجدت ذلك عندی یا ابن آدم استسقیتك فلم تسقنی قال: یا رب کیف أسقیك وأنت رب العالمین قال: استسقاك عبدی فلان فلم تسقه أما إنك لو سقیته وجدت ذلك عندی (۵)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالی قیامت کے دن فرمائیگا: اے انسان! میں بیمار ہوا تو نے میری مزاج پرسی نہیں کی، بندہ کہے گا الٰہی میں تیری عیادت کیسے کرتا تو تو جہانوں کا رب ہے، خدا تعالی فرمائے گا کیا تجھے خبر نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تو تو نے اس کی بیمار پرسی نہ کی، کیا تجھے خبر نہیں اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، اے انسان! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے نہ کھلایا، عرض کرے گا الٰہی تجھے میں کیسے کھلا سکتا ہوں تو تو جہانوں کا رب ہے، خدا فرمائے گا کیا تجھے علم نہیں کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا، تو نے اسے نہ کھلایا، کیا تجھے پتہ نہیں کہ اگر تو اسے کھلاتا تو میرے پاس آتا، اے انسان! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے نہ پلایا، عرض کریگا مولیٰ میں تجھے کیسے پلاتا تو تو جہانوں کا رب ہے، خدا فرمائے گا تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تو نے اسے نہ پلایا، اگر تو اسے پلاتا تو آج میرے پاس وہ پاتا۔

قرآن کی نظر میں انسان کا مقصد وجود محض اس کے رب کی عبادت اور اس کی خوشنودی کا حصول ہے، قرآن کہتا ہے کہ ہم نے انسانوں اور جنوں کو صرف رب کی یاد کے لیے پیدا کیا ہے، رب کی یاد کا بہترین طریقہ تزکیہ نفس ہے اور تزکیہ نفس کا بہترین طریقہ دنیا سے محبت کا خاتمہ ہے۔

دنیوی زندگی قرآن کی نظر میں

قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں ظلم و بربریت کی اصل بنیاد دنیا سے بے پناہ محبت اور دنیا کی ہر نعمت و آسائش کو اپنی مختصر سی زندگی میں سمیٹ لینے کی خواہش رہی ہے، اور ان خواہشات کے حصول کا ذریعہ مال ہے، قرآن کریم تزکیہ نفس کے ذریعے مال و دولت اور دنیا کی محبت کو کم سے کم تر کرنا چاہتا ہے تاکہ بندے اس دنیا کے بجائے اس دنیا کے طلب گار ہو جائے، یہ مختصر دنیا جس کے لیے انسان اس قدر تگ و دو کرتا ہے کتنی مختصر ہے اس کے بارے میں قرآن کریم بتلاتا ہے کہ ''قیامت کے دن محتاط اندازہ لگانے والا کہے گا، کہ نہیں تمہاری دنیا کی زندگی تو بس ایک دن کی زندگی تھی (۶) پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا، کہ بتاؤ تم زمین میں کتنے سال رہے وہ کہیں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ہم وہاں ٹھہرے، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے ارشاد ہوگا تھوڑی ہی دیر ٹھہرے کاش! کہ تم نے اس وقت جانا ہوتا (۷) اور جب وہ ساعت (قیامت) برپا ہوگی، تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے (۸) انہیں یوں

معلوم ہوگا کہ جیسے دنیا میں دن کے ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے (۹) اس روز یہی دنیا کی زندگی انہیں ایسی محسوس ہوگی گویا یہ محض گھڑی بھر محض آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھہرے تھے (۱۰) دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں متاع قلیل کے سوا کچھ نہیں (۱۱)

دنیا کی حیثیت

جب دنیا کی زندگی اس قدر ناپائیدار مختصر، اتنی بے معنی اور اس قدر قلیل ہے تو اس کے لیے طویل آرزوئیں، وسیع وعریض گھر، عالی شان محلات، خوبصورت باغات اور روپے پیسے کو جوڑ جوڑ کر رکھنے اور گن گن کر کمانے کا کیا جواز باقی رہتا ہے، پھر توجہ کا مرکز یہ دنیا نہیں وہ دنیا ہوتی ہے، پھر محبت اس دنیا سے نہیں اس دنیا سے ہوتی ہے، پھر دل یہاں نہیں اٹکتا وہاں رہ جاتا ہے، حقیقت میں انسان کا دل وہاں ہوتا ہے، جہاں اس کا مال ہوتا ہے، مؤمن کا مال آخرت میں جنت کی صورت میں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے، اس وعدے اور عقیدے کے نتیجے میں ایک مؤمن کا دل دنیا سے نکل کر آخرت کی طرف پرواز کر جاتا ہے اس کے نتیجے میں فکر آخرت، فکر دنیا پر غالب آکر اس ذلیل وحقیر دنیا کو دھتکار دیتی ہے، یہ وہی دنیا ہے جس کے بارے میں ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے ''اپنے ایک مری ہوئی بکری کی طرف اشارہ کر کے صحابہ سے پوچھا کہ کوئی اسے دو درہم میں لینا پسند کرے گا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اسے تو کوئی مفت میں بھی نہیں لے گا، تو ارشاد ہوا اللہ کی نظر میں دنیا کی حیثیت اس سے بھی حقیر اور کمتر ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا آخرت کے راستے کی پہلی منزل ہے اور قبر اس راستہ کی دوسری منزل ہے اس دنیا کی درستگی اس دنیا کے درست ہونے سے ہوتی ہے اس لیے حدیث میں دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے جو کچھ اس دنیا کی کھیتی میں بوئیں گے وہی آخرت میں کاٹیں گے، اس دنیا کی صحیح طریقے سے دیکھ بھال ہی آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے، موت کی یاد اس ضمانت کا بنیادی محور ہے، جو ہمارا رشتہ اِس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اُس دنیا سے جوڑ دیتی ہے، یہ یاد مؤمن کا اصل سرمایہ ہے، موت کی یاد اسے دنیا سے بے پرواہ کر دیتی ہے، یہ یاد اس کے دل سے مال کی محبت خارج کرتی ہے، اس کے داخل کو آئینہ بناتی، اس کے ایمان کو راستہ دکھاتی اور پر لگا کر اخلاق کی بلندیوں تک لے جاتی ہے۔

حب دنیا جنگ وجدل اور تنازعات کا باعث

قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس دنیا کی محبت ہی انسان کو سرکشی پر اُکساتی ہے، وہ کہتا ہے وہ مال ودولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہوں حالانکہ آخرت بہتر اور باقی رہنی والی ہے، دنیا میں تمام جنگیں، خونریز تنازعات، فسادات، ہنگامے، اختلافات، دنیا طلبی، عیش پرستی اور ہوس ملک گیری کے باعث پیدا ہوئی اس لیے قرآن دنیا پرستی کے بجائے آخرت کی محبت کو بار بار تازہ کرتا ہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انسان خواہ گزشتہ دور کا ہو یا عہد حاضر کا، اسکی سب سے بڑی گمراہی اپنے مال ودولت میں اپنی مرضی ومن مانے طریقے کے مطابق تصرف کے اختیار کا شوق ہے، یہی شوق معاشرہ میں فتنہ وفساد کا باعث بنتا ہے، جس کے سبب خونریزی عام ہوتی ہے، قتل، ڈاکہ زنی، دہشت گردی، چوری اور فتنہ وفساد کی آگ اٹھتی ہے، جس کے سبب معاشرے تباہ ہوتے

اورفرد کی آخرت ضائع ہوجاتی ہے، اس لیے تمام انبیاء مال ودولت کا تزکیہ کرتے ہیں، لہٰذا ہرامت میں زکوۃ ، انفاق فی سبیل اللہ، خیرات، فراخدلی کو بنیادی اخلاقیات قرار دیا ہے، جس کے بغیر کسی فرد کی آخرت درست نہیں ہوسکتی، خواہ وہ نماز، روزے اور حج کے امور میں کتنا ہی منہمک کیوں نہ ہوں، انبیاء کرام انسانوں کو مال ودولت مرضی رب کے تابع اور مطابق استعمال کرنے کا حکم دیتے ہیں، اس لیے خدا کے آگے سر جھکانا، سجدہ میں گر جانا بہت آسان مگر خدا کے بتائے ہوئے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہونا اور اس کے سامنے اپنی انا کو ریزہ ریزہ کردینا مشکل کام ہے، اس لیے قرآن کریم کی سورہ المائدہ میں ان لوگوں کو فاسق، ظالم اور کافر کہہ کر پکارتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے آگے سر نہیں جھکاتے اور اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتے (۱۲) اس لیے اُسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ حکمران 'ریاست' رعایا اور معاشرہ اگر اللہ کے آگے تو سر جھکادے مگر اس کے احکامات کو عملاً تسلیم کرنے سے انکار کردے تو ان کا ایمان قابل اعتبار نہیں رہتا، اسی لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زکوۃ کی ادائیگی کا انکار کرنے والوں کے خلاف قتال کا حکم جاری کردیا تھا۔

دلوں سے دنیا کی محبت نکالنا

دنیا کی محبت دلوں سے خارج کرنا ہی اصل تقاضائے دین ہے، چونکہ یہی محبت تمام گناہوں کی بنیاد ہے اس لیے ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے، یہ دنیا کوچ کرچکی ہے، جاری ہے اور آخرت بھی روانہ ہوچکی ہے، قریب آرہی ہے اور ان دونوں میں سے ہرایک کے پرستار ہیں تم اسے جہاں تک ہوسکے دنیا پرست نہ بنو تم اس وقت عمل کے گھر میں ہو اور حساب کا وقت نہیں آیا اور کل تم حساب کے گھر (آخرت) میں ہوں گے اور وہاں عمل کا موقع نہ ہوگا (۱۳) یہ دنیا کہ محبت ہے جو حکمرانوں ، امیروں ، جاگیرداروں، سرمایہ دار، خوشحال لوگوں کو غرباء پر فراخ دلی سے خرچ کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، یہ رکاوٹ ہٹ جائے تو اس بستی میں کوئی باپ بھوک کے خوف سے خودکشی نہ کرے، کوئی بیٹی کم جہیز لانے کی پاداش میں زندہ نہ جلائی جائے، کوئی بہو ساس کے طعنوں کے خوف سے خودکشی نہ کرے، کسی باپ کی آنکھ میں آنسو کے جگنو نہ ہوں اور کوئی ماں مستقبل کے اندیشوں سے راتوں کو رونے والی نہ رہے۔

عیاشی اور فضول خرچی کی مذمت

اسلامی تزکیہ نفس کے لیے انسان کا تعلق مال سے کمزور کرتا ہے اور قدم قدم پر تعلق کمزور کرنے کے لیے بدنی عبادات کے ساتھ ساتھ مالی عبادات پر بے پناہ زور دیتا ہے، وہ بخل، شح نفس، عیاشی، فضول خرچی، کنز، کی شدید مذمت کرتا ہے، لہٰذا پیدائش سے لے کر موت تک مؤمن کی زندگی خیر، فضل، انفاق، زکوۃ اور صدقے کی تقسیم میں بسر ہوتی ہے، عقیقہ، مہر، میراث، نان نفقہ کی ذمہ داری، دیت، مہمل قسموں کا کفارہ، مسکینوں کو کھانا کپڑا اور غلام کی آزادی، حج کے ارکان میں تقدیم وتاخیر کی صورت میں مختلف نوعیت کی مالی عبادات، قربانی، آپس کے معاملات میں فراخ دلی، بخل سے گریز، شح نفس کا حکم، عصبی رشتہ دار، ماں باپ، یتیم، مسکین، مسافرین ،غلاموں، کنواروں، بیواؤں، امداد مانگنے والوں کی حاجت پوری کرنا، ضرورت مند لوگوں کو تلاش کرکے مدد کرنا، میراث میں ورثاء سے

ہٹ کر وصیت کرنا، حجاج، مسافروں کی مہمان نوازی، خدمت خلق، مساجد کی تعمیر، کنویں مہمان سرائے کا قیام، ان تمام اعمال کے ذریعے قرآن نے عبادات کو مالیات سے منسلک کر کے انسان کے اندر مال کی محبت میں کمی پیدا کرنے کے تمام اسباب مہیا کر دیے ہیں، جس کے ذریعہ ایک ایسا فیاض معاشرہ وجود میں آتا ہے جو معاشرے کے کچلے ہوئے طبقات کی تعمیر و ترقی کے لیے قدم بہ قدم پر کار خیر کے بہانے ڈھونڈتا ہے، جس کی دولت تقسیم کے راستے تلاش کرتی ہے اور جس کا مال لوگوں تک بغیر طلب کے پہنچ جاتا ہے ایسے فیاض، مہربان اور نجی معاشروں پر قدرت بھی مہربان ہو جاتے ہیں دنیا کے کسی بھی معاشرے میں مالی عبادات کا ایسا زبردست نظام نظر نہیں آتا۔

شح نفس اور بخل ایک جرم

افسوس یہ ہے کہ اس نظام کے باوجود عالم اسلام خصوصاً پاکستان میں لوگ خودکشی پر مجبور کر دیے گئے ہیں، قرآن حکیم نے بخل کو سنگین جرم قرار دیا اور اس جرم کی پاداش میں ایک قوم کو تباہ کر کے دوسری قوم کو لے آنے کی وعیدیں بھی سنائیں

هَاأَنتُم هَـٰؤُلَاءِ تُدعَونَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنكُم مَن يَبخَلُ وَمَن يَبخَل فَإِنَّمَا يَبخَلُ عَن نَفسِهِ وَاللَّهُ الغَنِيُّ وَأَنتُمُ الفُقَرَاءُ وَإِن تَتَوَلَّوا يَستَبدِل قَومًا غَيرَكُم ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمثَالَكُم (۱۴)

تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اس پر تم میں ہی سے جو لوگ بخل کر رہے ہیں اللہ تو غنی ہے تم ہی اس کے محتاج ہو اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا، اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے

شح نفس اور بخل ایسا جرم ہے کہ جس سے ایک قوم کے سارے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، مال کی محبت حرام نہیں اگر یہ محبت مرضی خالق کے تابع ہو اور اس کی مخلوق کے لیے حاضر ہو، اگر مال رب کی یاد میں رکاوٹ بن جائے تو یہ مال نہیں وبال ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کردہ عظیم الشان صحابہ کرام کے معاشرے کا اعجاز اور کمال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے دل سے مال کی محبت نکال دی تھی، مال اور دولت سے صحابہ کرام کی بے رغبتی کا عالم یہ تھا کہ قران کے الفاظ میں صحابہ کرام پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا خرچ کریں تو آسمان سے جواب آتا ہے کہ جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو، صحابہ کرامؓ نے اللہ کی مقرر کردہ اس حد کو بھی پار کر دیا اور ایثار و قربانی کی وہ روایتیں قائم کیں جو دنیا کی تاریخ میں نایاب ہیں، قرآن نے اس کی شہادت دیتے ہوئے کہا

وَيُؤثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِم وَلَو كَانَ بِهِم خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفسِهِ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ المُفلِحُونَ (۱۵)

کہ وہ (صحابہ کرام) اپنی ذات کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں

قومیں کب غالب آجاتی ہیں؟

مال کی محبت کے حوالے سے قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَا يَسأَلكُم أَموَالَكُم إِن يَسأَلكُمُوهَا فَيُحفِكُم تَبخَلُوا وَيُخرِج أَضغَانَكُم (۱۶)

اللہ پورا مال طلب نہیں کرتا ورنہ اگر کہیں تمہارے سب کے سب مال طلب کرے تو بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار دے گا۔

اس رعایت کے باوجود حضرت ابوبکر صدیقؓ نے غزوہ تبوک کے موقع پر اپنے گھر کا تمام مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ تو فرمایا صدیق کے لیے اللہ اور اللہ کا رسول کافی ہے، حضرت کعبؓ کی براءت کا اعلان ہوا تو حضرت کعبؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری توبہ میں میرے پورے مال کا صدقہ بھی شامل ہے ، میں اپنا تمام مال اللہ کی راہ میں دیتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روک دیا اور فرمایا کہ نہیں کچھ مال اپنے لیے رکھ لو، غزوہ تبوک کے موقع پر ایک صحابی کے پاس اللہ کی راہ میں دینے کے لیے کچھ نہیں تھا، ایک باغ میں رات بھر مزدوری کی اجرت میں ایک سیر کھجور ملیں تو وہ سب کی سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اخلاص کو دیکھتے ہوئے ان کھجوروں کو اس تمام مال پر بکھیر دیا، جو غزوہ تبوک کے لیے جمع کیا گیا تھا، اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مال بھی شامل تھا، کسی معاشرے میں جب مال سے محبت اتنی کم ہو جاتی ہے تو انسان کی نظر میں زندگی بڑی حقیر ہو جاتی ہے، جس کے بعد قیصر و کسریٰ ان لوگوں سے لرزتے ہیں جو موت کے لیے جیتے ہیں، موت سے بے خوفی امتوں کو پناہ کر دیتی ہے اور ان کے مقابلے میں آنے والی قوتیں تاریخ کے کونوں میں پناہ ڈھونڈتی پھرتی ہیں، اس لیے جن معاشروں میں مال کی محبت مغلوب ہو جاتی ہے، وہ معاشرے دنیا پر غالب آ جاتے ہیں اور جن معاشروں میں یہ محبت غالب آ جاتی ہے وہ صرف غلبہ دین کی حکمت عملی، میدان سیاست میں تلاش کرتے ہیں، سورۃ انفال میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم بیس ہو تو دو سو پر غالب آؤ گے، مگر بعد میں تنظیمی کمزوریوں کی بناء پر اجازت دے دی کہ اگر تم سو ہو تو دو سو پر غالب آ جاؤ گے (۱۷) مگر صحابہ کرام نے اللہ کی اس رخصت کو عزیمت میں بدلتے ہوئے غزوہ موتہ میں سابقہ حیثیت کو بحال کر دیا اور ڈیڑھ لاکھ کے رومی لشکر کا مقابلہ صرف تین ہزار صحابہ کے لشکر سے کیا، یہ اس لیے ممکن ہوا کہ صحابہ کے دل دنیا اور مال کی محبت سے خالی تھے اور موت سے بے خوف تھے یہ رویے اگر ہمارے معاشرے میں پیدا ہو جائیں تو غربت کی شرح لمحوں میں کم ہو سکتی ہے۔

اسلامی معاشرے اور تحریکوں کا فرض منصبی

اس وقت عالم اسلام، پاکستان، تمام اسلامی معاشروں اور تحریکوں کا فرض ہے کہ وہ امت کو دنیا پرستی کی دلدل سے نکالنے کے لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سنتوں کو زندہ کریں جن کا خصوصی تعلق معاش، معیشت، اقتصاد سے ہے، ان سنتوں کو زندہ کرنے کے نتیجے میں معاشرے سے خودکشی اور غربت کا خاتمہ ہوگا، ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس نے میری ایسی سنت کو (جو مر چکی ہو) پھر سے زندہ کیا اس کے لیے اس پر تمام عمل کرنے والوں کا اجر ہوگا، اور ان کے عمل میں کوئی کمی نہ کی جائے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کو مشکل حالات میں، معیار معیشت میں مساوات بہت پسند تھی، بخاری کی روایت ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اشعری قبیلے کے لوگوں کا یہ معمول اور وطیرہ ہے کہ جب انہیں غزوہ کی حالت میں سامان خورد ونوش کی قلت پیش آتی ہے یا مدینہ میں بہ حالت امن قحط وغیرہ کی وجہ سے اہل وعیال کے لیے خوراک کی کمی محسوس ہوتی تو ان کے پاس بچا ہوا جتنا سامان، خوراک ہوتا تو ایک جگہ جمع کر لیتے اور پھر ایک پیمانے سے اپنے درمیان برابر تقسیم کر لیتے پس وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں(۱۸)

ایک دن کا واقعہ ہے کہ اتفاقاً کسی قبر میں کچھ رخنہ رہ گیا، قبر پورے طور پر برابر نہیں کی گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رخنے کو دیکھا تو ارشاد فرمایا، اس رخنے کو بند کر دیا جائے، ایک صحابی نے جو پاس ہی کھڑے تھے عرض کیا یا رسول اللہ! اس بے چارے مردے کو اس بندش سے کیا نفع پہنچے گا، ارشاد ہوا کہ بے شک نہ اس سے ضرر پہنچتا ہے نہ نفع مگر اس سے زندہ لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

جو ہستی قبر کے رخنے کو برداشت نہیں کرتا وہ زندگی میں اپنی امت کے اندر بڑے بڑے معاشی رخنوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ جب لوگ تنگ وتاریک کوٹھڑیوں میں جانوروں کی طرح رینگ کر داخل ہوتے ہیں، کوڑے دان سے رزق چن کر پیٹ بھرتے ہیں، حشرات الارض کی طرح زمین پر بستے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سب کچھ کیسے گوارا ہو سکتا ہے؟ اس امت اور ریاست، معاشرے کا فرض بنتا ہے کہ وہ قبر کے رخنے کی طرح معاشیات کے تمام رخنے بھر دے۔

فرمایا ہر مسلمان پر صدقہ کرنا واجب ہے اس پر صحابہ نے سوال کیا کہ اگر کسی کے پاس صدقہ کے لیے کچھ نہ ہو تو کیا کرے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرے جو ملے اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں پر بھی خرچ کرے، صحابہ نے عرض کیا کہ اس کی بھی طاقت نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کسی ضرورت مند اور مصیبت زدہ کی (مال کے سوا کسی اور طریقے سے) مدد کرے، عرض کیا گیا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کیا کیا جائے ارشاد فرمایا، بھلائی کا حکم دے یا معروف کا حکم دے، عرض کیا گیا کہ اگر کوئی شخص یہ بھی نہ کر سکے تو اس کے لیے کیا ہدایت ہے فرمایا وہ برائی سے رک جائے یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے(۱۹)

یہ تمام احادیث پڑھنے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ دیکھنے کے بعد اور ایک حدیث پیش خدمت ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ایک راستے سے گزرے تو ایک بلند عمارت نظر آئی فرمایا کس کا مکان ہے؟ صحابہ نے ایک صحابی کا نام لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے جب وہ صحابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو منہ پھیر لیا، انہوں نے دوستوں سے ناراضگی کا سبب دریافت کیا تو واقعہ سنایا گیا، وہ گئے اور مکان کو منہدم کر دیا تو لوگوں نے واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو فرمایا ہر وہ مکان جو ضرورت سے زائد ہو صاحب خانہ پر وبال ہے۔

صحابہ کرامؓ کو نبی رحمت کی نصیحت

صحابہ کرامؓ کو ہدایت کی گئی کہ جب گھر میں پھل لاؤ تو ہمسائے کو بھی بھیجو اگر نہ بھیج سکو تو اس کے چھلکے باہر نہ پھینکو، اس سے ہمسائے کے بچوں کو اذیت ہوگی، معمولی پھل کے چھلکوں سے بچوں کو پہنچنے والی اذیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گوارا نہ تھی تو یہ بات کیسے گوارا ہوتی کہ مدینۃ النبی میں جب عام لوگوں کے پاس ضروریات کے مطابق مکان نہیں ہیں تو چند لوگ ایسے مکانات کیوں تعمیر کریں، جب انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے؟ اس اصول کے تحت اسلامی معاشروں پر نظر ڈالی جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس معاشرے اور ملک میں لوگ تین دن تک فاقے سے رہ کر خودکشی پر مجبور ہوں اور جس ملک وشہر میں لوگوں کو رہنے کے لیے چند گز کا گھر بھی دستیاب نہ ہو، وہاں عالی شان محلات کا وجود مرد مؤمن کا وجود کیسے گوارا کرسکتا ہے، پھلوں کے چھلکوں سے دل آزاری کو روکنے والی امت عالی شان محلات کی صورت میں غرباء اور مساکین کی مستقل دل آزاری کیسے برداشت کرسکتی ہے؟ کیا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اب کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سنتوں کو زندہ کرے اور انہیں پھر سے جاری وساری کردے، علمائے کرام، اسلامی تحریکیں اور دین دار طبقے اس نکتے کو پیش نظر رکھ لیں تو ملک میں خودکشی کی تمام وارداتیں لمحوں میں ختم ہوسکتی ہیں۔

مصادر ومراجع

(۱) المعارج : ۲۵، ۲۶ (۲)المائدة:۳۳(۳)الحجرات : ۹ (٤)المنافقون :۹ (٥)مسلم : ۲٥٦۹ (٦)طه : ۱۰٤ (۷)المؤمنون : ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱٤ (۸) الروم:٥٥ (۹)الاحقاف : ۳٥ (۱۰)یونس: ٤٥ (۱۱)الرعد:۲٦(۱۲)المائدة: ٤٤، ٤٥، ٤۷ (۱۳)مشکوة (۱٤)محمد: ۳۸(۱٥)الحشر :۹(۱٦) محمد: ۳٦، ۳۷(۱۷)الانفال: ٦٥، ٦٦(۱۸)البخاری (۱۹)البخاری

مفتی صدام مارتونگی

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی
تاریخ وفات کا ایک تحقیقی جائزہ

ربیع الاول کا مہینہ گزر گیا، اس مہینے کے ساتھ کچھ رسمیں، کچھ عقیدتیں، کچھ خرافات کچھ عادات، کچھ حقائق اور کچھ دقائق وابستہ ہیں، ہم افراط وتفریط کے درمیان پلے پڑے ہیں اور ہماری پرورش دو انتہاؤں پر ہوئی ہے اعتدال جو کہ دین حق میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اسے ہم بھلا بیٹھے ہیں، نقل در نقل کی عادت ایسی پختہ ہوئی کہ عقلوں پر پردے آ گئے۔

یوم ولادت اور یوم وفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کوئی قطعی اور طے شدہ مسائل نہیں ہیں کہ جن پر بحث کی گنجائش نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق ظنی مسائل سے ہیں اور ظنی مسائل بعد از بحث اور دلائل بھی ظنی ہی رہتے ہیں لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے انہیں ایسا قطعی سمجھا ہے جس میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں۔ زیر نظر مضمون میں یہی بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

الصدیق کی ان ہی صفحات پر قارئین کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ تحقیق کی ماند پڑتی روایت کو پھر سے زندہ کیا جائے گا، آیئے! وفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کو اٹھا کر حقائق کا سامنا کرتے ہیں، سب سے پہلے ان امور کو بالترتیب ذکر کیا جاتا ہے جن پر محدثین ومؤرخین کا اتفاق ہے☆ سال وفات ۱۱ ہجری ہے☆ مہینہ ربیع الاول کا ہے☆ یکم سے ۱۲ تک کوئی تاریخ تھی☆ دو شنبہ کا دن تھا کما رواہ البخاری فی صحیحہ قال لھا فی ای یوم توفی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم؟ قالت؛ یوم الاثنین (۱) وکذا فی الشمائل قبض رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوم الاثنین و لیلۃ الثلاثآء و دفن من اللیل و فیہ عن ابن عبدالرحمان بن عوفؓ قال توفی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوم الاثنین و دفن یوم الثلاثآء (۲)

دن کی تعیین کے بعد چونکہ تاریخ وفات کے بارے میں کوئی ایسی صحیح صریح روایت منقول نہیں ہے جس پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ ہو اس لئے محدثین اور مؤرخین اس روایت کو زیر بحث رکھتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے جب حج کیا تو اس دن یوم عرفہ کس دن تھا؟ سو اس بارے میں بھی صحیح بخاری کی روایت ہے کہ یوم عرفہ یوم جمعہ تھا و ھو قائم بعرفۃ یوم الجمعہ (۳)

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد اب آتے ہیں تاریخ وفات کے بارے میں مشہور نقطہ ہائے نظر کی طرف اس بارے میں مفکرین کی تین نقطہ نظر ہیں۔

☆ اکثر مؤرخین بارہ ربیع الاول کو تاریخ وفات قرار دیتے ہیں(۴)

☆ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ اور بعد میں مفتی شفیع عثمانیؒ نے دو ربیع الاول کو تاریخ وفات لکھا ہے(۵)

☆ علامہ شبلی نعمانی نے یکم ربیع الاول کو ترجیح دی ہے(۶)

اب اگر مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں دیکھا جائے تو ۹ ذی الحجہ کو جمعے کا دن ہے اور ربیع الاول کے کسی پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس درمیان میں تین مہینے اور چار احتمالات ہیں (۱) تینوں مہینے تیس کے فرض کر لئے جائے (۲) تینوں مہینے ۲۹ کے فرض کر لئے جائے (۳) دو مہینے ۳۰ کے ہو اور ایک ۲۹ کی (۴) دو مہینے ۲۹ کے ہو اور ایک ۳۰ کی۔ نقشہ کچھ یوں بنتا ہے

تینوں ۳۰ کے	۲۹/صفر، پیر	۶/ربیع الاول، پیر	۱۳/ربیع الاول، پیر
تینوں ۲۹ کے	۲/ربیع الاول، پیر	۹/ربیع الاول، پیر	۱۶/ربیع الاول، پیر
دو ۲۹ کے اور ایک ۳۰	۱/ربیع الاول، پیر	۸/ربیع الاول، پیر	۱۵/ربیع الاول، پیر
دو ۳۰ کے اور ایک ۲۹	۳۰/ صفر، پیر	۷/ربیع الاول، پیر	۱۴/ربیع الاول ، پیر

سب سے پہلے ۱۲ ربیع الاول والے رائے کو زیر بحث لاتے ہیں ان حضرات پر وہ مشہور اعتراض وارد ہوتا ہے کہ بھائی ۴ احتمالات میں سے کسی بھی احتمال کے مطابق ۱۲ ربیع الاول پیر کے دن نہیں آتا؟ تو یہ حضرات جواب دیتے ہیں وحلہ ان یقال یحتمل اختلاف اھل مکہ والمدینہ فی رؤیۃ ھلال ذی الحجہ فیکون غرتھا عند اھل مکہ الخمیس و عند اھل المدینہ الجمعہ وکان الوقوف برؤیۃ اھل مکۃ فلما رجع الی المدینہ اعتبر برؤیتھا وکان الشھور الثلاثہ الکوامل فیکون اول ربیع الاول یوم الخمیس ویوم الاثنین الثانی عشر منہ (۷)

یعنی کہ تینوں مہینے تیس کے ہیں نیز وقوف عرفہ میں اہل مکہ کی رؤیت کا اعتبار کیا گیا اور تاریخ وفات میں اہل مدینہ کی رؤیت کا اعتبار کیا گیا اس لحاظ سے ۱۲ ربیع الاول پیر کے دن ہوا، لیکن اس جواب کا ضعف خود یقال اور یحتمل کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، نیز تینوں مہینے تیس کے مان لینا اور پھر اختلاف رؤیت دور کی تاؤیلات ہیں جن پر ٹھوس دلائل اور قرائن کی ضرورت ہیں خود علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے وھذا الجواب بعید لکھ کر اس جواب کو کمزور قرار دیا ہے(۸)

جو حضرات ۲ ربیع الاول کو تاریخ وفات قرار دیتے ہیں ان کے پاس بھی توجیہ کے لئے دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ تینوں مہینے ۲۹ کے فرض کئے جائے جو کہ مشکل ہے یا پھر اختلاف رؤیت کا سہارا لیا جائے جس پر مضبوط دلیل نہیں اگر مذکورہ بالا اعتراض کی وجہ سے جمہور کی رائے مسترد ہو سکتی ہے تو پھر دو ربیع الاول والی رائے کیوں نہیں۔

لے دے کر ہماری پاس تیسری رائے بچتی ہے جو کہ یکم ربیع الاول کی ہے جب دو مہینے ۲۹ کے اور ایک ۳۰ کی فرض کر لئے جائے یہ صورت کثیر الوقوع بھی ہے اور اس کے لئے کسی تاویل کی بھی ضرورت نہیں۔

یادرہے کہ پہلی دورائے صرف حسابات کی وجہ سے مسترد نہیں ہوئی بلکہ تاریخ معلوم کرنے کے لئے ان احادیث کو بنیاد بنایا گیا جن کا تذکرہ شروع میں ہوا، نیز جمہور کی رائے سے اختلاف کی گنجائش خود ابن حجر عسقلانیؒ نے دور ربیع الاول کی قول اختیار کر کے نکالی ہے، سومزید اختلاف کی گنجائش ہے، نیز یکم ربیع الاول کو تاریخ وفات قرار دینے کی اور بھی وجوہ ترجیح ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں

☆ سب سے مضبوط وجہ ترجیح وہ مشہور روایت ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ نبی علیہ السلام کی وفات آیت الیوم اکملت لکم کے ۸۱ دن بعد ہوئی(۹) اور ۸۱ دن تب بنتے ہیں جب یکم ربیع الاول کو تاریخ وفات قرار دیا جائے کیونکہ مذکورہ آیت عرفہ کے دن نازل ہوئی تھی چنانچہ بخاری کی روایت ہیں قالت الیھود لعمر انکم لتقرؤون آیة لو نزلت فینا لاتخذناھا عیدا فقال عمرانی لاعلم حیث انزلت واین انزلت واین رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم حیث انزلت یوم عرفة وانا واللّٰہ بعرفة(۱۰)

☆ شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان قدس سرہ نے بھی یکم ربیع الاول کو ترجیح دی ہے چنانچہ لکھتے ہیں ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات یکم ربیع الاول کو ہوئی آپ کی وفات کا پیر کے دن بارہ ربیع الاول کا جو قول مشہور ہے وہ تحقیقی نہیں ہے''(۱۱)

☆ یکم ربیع الاول کی روایت ارباب سیر میں سے موسیٰ بن عقبہ اور مشہور محدث امام لیث مصری سے بھی منقول ہے۔(۱۲)

☆ ابونعیم نے بھی اپنی کتاب دلائل میں یکم ربیع الاول تاریخ وفات نقل فرمائی ہے(۱۳)

مصادر ومراجع

(۱) بخاری کتاب الجنائز

(۲) شمائل ترمذی باب ما جآء فی وفاة رسول الله صلی الله علیه و سلم

(۳) بخاری باب زیادة الایمان و نقصانه

(۴) شمائل ترمذی مع خصائل نبوی ،ص ی٤٥٦

(۵) فتح الباری، ج ۷، ص ۷۳٦ اور سیرت خاتم الانبیاء ، ص ۱۰٤

(٦) سیرت النبیصلی الله علیه وسلم ،ص ٤۷۷

(۷) خصائل ص٤٥۷

(۸) فتح الباری ج ۷ ص ۷۳٦

(۹) ابن کثیر معارف القران ج ۳ ص ۳۳

(۱۰) بخاری کتاب تفسیرالقران سورة المائده

(۱۱) کشف الباری کتاب التفسیر ص ۱۷٦

(۱۲) فتح الباری ج ۷ ص ۷۳٦ (۱۳) ص۱۴٦ بحوالہ سیرت النبی ص۴۷۷

مولانا فضل وہاب بنوری
مدرس معہد ہذا

واقعہ طاعون عمواس

ایک تحقیقی جائزہ

۱۷ھ کے آخر یا ۱۸ھ کے آغاز میں شام، عراق اور مصر میں سخت طاعون پھیلا، حضرت عمرؓ کو جب خبر پہنچی تو آپ بذات خود تدبیر وانتظام کے لئے شام کی طرف روانہ ہوئے، جب آپ مقام سرغ پہنچے تو امراء لشکر استقبال کے لئے حاضر ہوئے، امراء نے وباء کی شدت کی خبر دی اور عرض کیا، یا امیر المؤمنین! آپ کا اس موقعہ پر تشریف لانا مناسب نہیں، آپ نے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا، ان کی رائے میں اختلاف ہوا، حضرت عمرؓ نے واپسی کی رائے کو ترجیح دی، مگر حضرت ابوعبیدۃ بن الجراحؓ مسئلہ تقدیر میں بہت سخت تھے، فرمانے لگے اے عمر! کیا تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو حضرت عمرؓ نے جواب دیا، ہاں تقدیر الٰہی سے تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتا ہوں، پھر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو الگ لے جا کر مسئلہ پر بحث کی۔

وبا پھیل جانے کی صورت میں فرار

دوسرے دن حضرت عبدالرحمان بن عوف بھی آگئے انہوں نے فرمایا میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ:

''جب تم سنو کہ کسی شہر میں یہ وباء ہے تو وہاں نہ جاؤ اور جب تم کسی شہر میں ہو اور وہاں یہ وبا پھیل جائے تو اس کے خوف سے نہ بھاگو'' حضرت عمرؓ نے اس حدیث کو سن کر اپنی رائے کی صحت پر خدا کا شکر ادا کیا اور وہاں سے مدینہ واپس ہوگئے۔(۱)

وبا سے متعدد صحابہ کرام کی رحلت

مدینہ پہنچ کر جب حضرت عمرؓ کو وباء کی ہلاکت آفرینی کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو خط لکھا کہ مجھے تم سے کچھ کام ہے کچھ دن کے لئے مدینہ آجاؤ، حضرت ابوعبیدہؓ نے جواب دیا، میں دوسرے مسلمانوں کو چھوڑ کر تنہا مدینہ نہیں آسکتا، امیر المومنین کو مجھ سے جو کام ہے وہ مجھے معلوم ہے آپ اس شخص کی زندگی چاہتے ہیں جو زندہ رہنے والا نہیں، مجھے آپ تعمیل حکم سے معافی دیں، آخر خود حضرت ابوعبیدہؓ بیمار ہوئے، جب مرض میں زیادتی ہوئی تو مسلمانوں کو اعمال حسنہ کی وصیت فرمائی، حضرت معاذ بن جبلؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور پھر رفیق اعلیٰ سے جا ملے، عمرو بن عاصؓ نے لوگوں سے کہا کہ یہ بلا انہی بلاؤں میں سے ہے جو بنی اسرائیل پر

نازل ہوئی تھیں، لہٰذا یہاں سے بھاگ چلنا چاہیے، حضرت معاذؓ نے سنا تو خطبہ دیا اور فرمایا کہ یہ وباء نہیں ہے بلکہ رحمت خداوندی ہے بھاگ جانے کی ضرورت نہیں، خطبہ کے بعد خیمہ پہنچے تو بیٹے کو بیمار پایا، تو فرمایا۔ یابنی الحق من ربك فلاتكونن من الممترين بیٹے نے جواب دیا ستجدنی ان شاء الله من الصابرين تھوڑی دیر بعد بیٹے نے انتقال کیا تو خود معاذؓ بیمار پڑ گئے اور بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کیا، حضرت معاذؓ نے اپنے بعد عمرو بن عاصؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔

عمرو بن العاصؓ کی تدبیر

عمرو بن عاصؓ فوج کو لے کر پہاڑوں پر چلے گئے اور اسے جابجا منتشر کر دیا۔ تب کہیں اس وباء سے نجات ملی۔ حضرت عمرؓ نے عمرو بن عاص کی اس تدبیر کو پسند کیا، اس وباء نے شام میں اسلامی طاقت کو بے حد نقصان پہنچایا، بیس ہزار جانباز جو نصف دنیا کی فتح کے لئے کافی تھے رحمت خداوندی کی آغوش میں جا سوئے، ان میں حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح حضرت معاذؓ اور یزید بن ابی سفیان بڑے پایہ کی ہستیاں تھیں (۲)

رومی مسلمانوں کی اس مصیبت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اگر انہوں نے مفتوحین کے دلوں کو اپنی رواداری اور حسن انتظام سے فتح نہ کر لیا ہوتا، جب وباء کا زور ختم ہو گیا تو شام کے انتظامات کو درست کر کے اور مرنے والوں کا سامان ان کے ورثاء میں تقسیم کرنے کے لئے حضرت عمرؓ خود شام کی طرف روانہ ہوئے، حضرت علیؓ کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا (۳)

طاعون عمواس اور تعدیہ امراض

اگر طاعون عمواس میں حضرت ابوعبیدۃ بن الجراحؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور عمرو بن العاصؓ کی اتباع حدیث کے پہلو کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مؤخر الذکر امیر تعدیہ امراض کے قائل تھے اور ان کا مستدل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ احادیث تھے۔

☆ فر من المجذوم فرارك من الاسد جزامی شخص سے اس طرح بچو جس طرح شیر سے بچتے ہو (٤)

☆ كان فی وفد ثقيف رجل مجذوم، فارسل اليه رسول صلى الله عليه وآله وسلم انا قد بايعناك فارجع قبیلہ ثقیف کے وفد میں ایک مجذوم آدمی تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیغام بھیجا، واپس چلا جا، ہم نے تیری بیعت لے لی (٥)

☆ لا يورد ممرض على مصح بیمار اونٹوں والا تندرست والے کے ساتھ (اپنے اونٹوں کو) پانی نہ پلائے (٦)

جب کہ ابوعبیدۃ بن الجراحؓ اور معاذ بن جبلؓ کے سامنے یہ احادیث تھیں۔

☆ان النبی علیه السلام اكل مع مجذوم، وقال، ثقة بالله توكلاً عليه نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

کوڑھی کے ساتھ کھانا کھایا، پھر فرمایا اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے اور اللہ پر توکل کرتے ہوئے(۷)

☆ابن حجرؒ نے امام طبریؒ سے ایک روایت نقل فرمائی ہے:ان امرأة سالتها عنه فقالت:ماقال ذلك، ولكنة قال، لاعدوى وقال فمن اعدى الاول؟ قالت:وكان لى مولى به هذا الداء، فكان ياكل فى صحافى ويشرب فى اقداحى وينام على فراشى(۸)

ان روایات میں اس طرح تطبیق ممکن ہے:

☆ پہلی توجیہ یہ ہے کہ تعدیہ امراض کا قول صحیح نہیں ہے جیسے کہ لا عدوی والے حدیث میں ہے لیکن فرار من المجذوم اس لئے فرمایا کہ بیمار آدمی جب صحیح تندرست آدمی کو دیکھے تو بیمار آدمی مزید حسرت ومصیبت میں مبتلا ہوگا۔

☆ دونوں احادیث کا محمل نفی اور اثبات دو مختلف احوال پر مبنی ہے، لاعدوی اس شخص سے فرمایا جس کا توکل واعتماد علی اللہ کامل ہو کہ اپنے آپ سے تعدیہ امراض کا گمان دفع کرسکتا ہے، اور فرار من المجذوم کا مخاطب وہ شخص ہے جس کا یقین ضعیف ہو اور صفت توکل اس میں ناقص ہو، اس وجہ سے سدالذرائع کے طور پر یہ حکم دیا، تاکہ تعدیہ کے اعتقاد کا باب ہمیشہ کے لئے مسدود ہوجائے۔(۹)

☆ ان احادیث میں عموم خصوص کی نسبت ہے یعنی لا عدوی سے تعدیہ امراض کی نفی علی العموم فرمائی مگر ان امراض سے جذام، برص اور جراب کو خاص فرمایا اور یہی ابن بطالؒ کا قول ہے۔(۱۰)

امام ابن قتیبہؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں احادیث میں تعدیہ امراض کی بحث نہیں ہے بلکہ دراصل یہ معاملہ ایک امر طبعی کے پیش نظر ہے، یعنی احادیث کا تعلق طبیعت سے ہے شریعت سے نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ فرار من المجذوم کا حکم تعدیہ امراض کی وجہ سے نہیں فرمایا گیا بلکہ اس لئے یہ حکم دیا کہ عام عادت میں مجذوم آدمی کی رائحہ اتنی سخت ہوتی ہے کہ جو شخص اس سے بات چیت میں ملاپ، اٹھک بیٹھک کرتا ہے تو وہ اس رائحہ سے بیمار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اطباء مجذوم آدمی کی مضاجعت ومجالست سے تعدیہ امراض کے خطرے کے پیش نظر منع نہیں کرتے ہیں بلکہ على طريق التأثر بالرائحه کی وجہ سے منع کرتے ہیں۔(۱۱)

اسی وجہ سے حدیث میں فرمایا لایورد ممرض على مصح اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا لا تديموا النظر الى المجذومين اور ابونعیمؒ نے نقل کیا ہے لكم المجذوم وبينك وبينه قيدرمحين اور امام طبریؒ نے نقل کیا ہے ان عمر رضى الله عنه قال المحيقب: جلس منى قيد رمح ان تمام تطبیقات میں سے راجح یہی آخری تطبیق ہے۔واللہ اعلم بالصواب

مصادر ومراجع

(۱) تاریخ الرسل والملوک: محمد بن جریر ج۴،ص۶۰، دار التراث بیروت، الطبعۃ الثانیۃ ۱۳۸۷ھ/۱۹۸۷ء

(۲) المنتظم فی تاریخ الأمم والملوک: ابن الجوزی، ج۴،ص۲۴۷، دار الکتب العلمیۃ بیروت، الطبعۃ الأولی: ۱۹۹۲ء/۱۴۱۲ھ

(۳) الکامل فی التاریخ: محمد بن محمد بن عبد الکریم الجزری، ج۲،ص۳۷۶، دار الکتاب العربی بیروت لبنان، الطبعۃ الأولی: ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷

(۴) مسند احمد، مسند المکثرین من الصحابۃ، مسند أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ، رقم: ۹۷۲۲، ج۱۵،ص۴۴۹، موسسۃ الرسالۃ، الطبعۃ الأولی: ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء

(۵) صحیح مسلم، کتاب الاداب، باب اجتناب المجذوم ونحوہ، رقم: ۱۲۶/۳۳۲۱، ج۴،ص۱۷۲۵

(۶) مسند احمد، مسند المکثرین، مسند أبی ہریرۃ، رقم: ۲۹۶۳، ج۱۵، ۱۴۹

(۷) مسند البزار المنشور باسم البحر الزخار، احمد بن عمرو العتکی، رقم: ۸۹۹۰، ج۱۵،ص۳۸۴، مکتبۃ العلوم والحکم المدینۃ المنورۃ

(۸) فتح الباری، کتاب الطب، باب الجذام، ج۱۰،ص۱۵۹

(۹) فتح الباری، کتاب الطب، باب الجذام، ج۱۰،ص۱۶۰

(۱۰) شرح صحیح البخاری لابن بطال، علی بن خلف، مکتبۃ الرشد الریاض، الطبعۃ الثانیۃ: ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۳

(۱۱) تاویل مختلف الحدیث، عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ، ج۱،ص۱۶۸، المکتب الاسلامی بیروت، الطبعۃ الثانیۃ: ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۹ء

آپ کے مسائل اوران کے جوابات

کیا فرماتے ہیں علما کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بیوی، بچے اسلام آباد میں رہتے ہیں، اسلام آباد میں میرا ذاتی گھر ہے، جس میں میرا بھائی رہائش پذیر ہے، میں گاؤں میں رہتا ہوں، جب سے میرے بچے اسلام آباد شفٹ ہوئے ہیں، میں نے اسلام آباد میں نہ پندرہ دن قیام کیا ہے، اور نہ ہی ارادہ ہے، اب مطلوب یہ ہے کہ وہاں پر میرا ذاتی گھر بھی ہے، اور بیوی بچے بھی، میں وہاں جا کر اسلام آباد میں مقیم ہوں گا یا مسافر؟ اگر مقیم ہوں اور میں نے وہاں سفر والا نماز پڑھ لیا تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصليا

شرعی نقطہ نظر سے جب اسلام آباد میں سائل کا ذاتی گھر ہے، اور بیوی بچے بھی، تو اسلام آباد اس کے حق میں وطن اصلی ہے، وہاں جا کر سائل پر پوری نماز پڑھنا لازم ہے، اگر قصر کر لیا تو نماز کا اعادہ کرنا لازم ہے، البتہ اسلام آباد جاتے ہوئے راستے میں اگر مسافت شرعی پایا جائے تو دوران سفر قصر لازم ہوگا۔

لما قال فی البحر الرائق: وهذا الوطن يبطل بمثله لا غير وهو أن يتوطن فی بلدة أخرى وينقل الأهل إليها فيخرج الأول من أن يكون وطنا أصليا حتى لو دخله مسافرا لا يتم (كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ج۲، ص۱٤۷ طبع دار الكتاب الإسلامی)

وقال الكاسانی رح: فالوطن الأصلی ينتقض بمثله لا غير وهو: أن يتوطن الإنسان فی بلدة أخرى وينقل لأهل إليها من بلدته فيخرج الأول من أن يكون وطنا أصليا حتى لو دخل فيه مسافرا لا تصير صلاته أربعا (بدائع الصنائع: كتاب الصلاة، فصل بيان مايصير المسافر به مقيما، ج۱، ۱۰۳ دار الكتب العلمية)

وقال فی الشامية: صلى الفرض الرباعی ركعتين۔۔۔ حتى يدخل موضع مقامه أی أی الذی فارق بيوته سواء دخله بنية الاجتياز أو دخله لقضاء حاجة لأن مصره متعين للإقامة فلا يحتاج إلى نية جوهرة،،،، أو ينوی إقامة نصف شهر (كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ج۲، ص ۱۲٤، ۱۲۳) والله اعلم بالصواب

مولانا برہان الدین
مدرس معہد ہذا

احوال وکوائف

سہ ماہی امتحان کے نتائج

صفرالمظفر کو مسجد معہد الصدیق میں سہ ماہی امتحان کے نتائج کی تقریب کا اہتمام مولانا عبدالرؤف بادشاہ کے زیر صدارت کیا گیا جس میں تمام درجات کے طلبہ کرام کو ان کے حاصل کردہ نمبرات سنائے گئے اور حضرت مہتمم صاحب نے اساتذہ کا شکریہ ادا کیا اور کامیاب طلباء کو خراج تحسین اور طلباء کی حوصلہ افزائی اور مزید محنت کی تلقین فرمائی۔

شش ماہی امتحان کا آغاز

معہد الصدیق میں شش ماہی امتحان کا آغاز ۲۰ ربیع الثانی بروز جمعرات کو ہوئی طلبہ نے نہایت وقار اور متانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امتحان میں شرکت کی اور اساتذہ کرام نے بہ خوبی اپنے فرائض سرانجام دیں۔

اہل علم کی آمد

قائد ملت اسلامیہ سربراہ دفاع پاکستان کونسل شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب معہد تشریف لائے اور سہ ماہی الصدیق کی دفتر میں رسالہ کے اچھے اور روشن مستقبل کے لیے خصوصی دعا فرمائی اور مولانا عبدالرؤف بادشاہ اور مفتی منفعت احمد کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے نہایت خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا اور اپنے تاثرات قلمبند کئے۔ حضرت شیخ مدظلہ کے ساتھ سابق ایم این اے فرزندار جمند حضرت مولانا سمیع الحق حضرت مولانا حامد الحق حقانی، مدیر ماہنامہ الحق حضرت مولانا راشد الحق سمیع، حضرت مولانا عرفان الحق حقانی، حضرت مولانا لقمان الحق حقانی اور مولانا اسامہ سمیع حقانی بھی شریک تھیں ان سب نے سہ ماہی الصدیق کے پہلے شمارے کو دیکھ کر مسرت کا اظہار فرمایا اور اسے معہد الصدیق کے لیے نیک شگون قرار دیا۔

جمعیت علمائے اسلام صوبہ پنجاب کے سیکرٹری جنرل مفتی سید محمد مظہر اسعدی تشریف لائے، اس دوران طویل گفت وشنید ہوئی معہد کے انتظامی امور خصوصاً معہد کا شعبہ تصنیف وتالیف، دار الصدیق اور سہ ماہی الصدیق کے حوالے سے تفصیلی بحث ومباحثہ اور مشاورت کے دوران انہوں نے سہ ماہی الصدیق کو بہت سراہا اور فرمایا کہ میں خصوصی طور پر سہ ماہی الصدیق کے اراکین اور ادارے کی زیارت کے لیے آیا ہوں، سہ ماہی الصدیق کی اشاعت پر خوشی ومسرت کا اظہار فرمایا اور مولانا عبدالرؤف بادشاہ اور مفتی منفعت احمد کو داد تشجیع سے نوازا۔

خطیب بے نوا مولانا محمد امیر بجلی گھر نور اللہ مرقدہ کے فرزند ارجمند خطیب ابن خطیب مولانا محمد قاسم بجلی گھر معہد تشریف لائے، معہد کے اساتذہ سے خصوصی نشست فرمائی اور والد مکرم مولانا محمد امیر بجلی گھر مرحوم کے یاد میں منعقدہ سیرت النبیؐ کانفرنس میں شرکت کرنے کی پرزور دعوت دی اور سہ ماہی الصدیق کے ترقی کے لیے ڈھیروں دعائیں فرمائی۔

تقریب کا انعقاد

فرینڈز آف بام خیل کے زیر اہتمام مولانا عبدالرؤف بادشاہ کے زیر صدارت ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس سے معہد کے نگران مولانا عبدالرؤف بادشاہ صاحب، ناظم تعلیمات مولانا ہارون الرشید صاحب، جناب پروفیسر ظاہر گل صاحب اور جناب محمد سعید صاحب نے اپنے خطابات سے طلباء کو محظوظ فرمایا اور پروگرام کے اختتام پر پوزیشن حاصل کرنے والے طلباء میں انعامات تقسیم کر کے طلباء کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

ایصال ثواب اور ختم قرآن

گذشتہ ایام میں نمونہ اسلاف، شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور پیر طریقت، انٹرنیشنل ختم نبوت کے امیر مولانا عبدالحفیظ مکی رحمہ اللہ دار فناء سے دار بقاء کی طرف کوچ کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون، ادارہ میں ان حضرات کی ایصال ثواب کے لیے ختم قرآن اور تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا، اور آخر میں مرحومین کے بلندی درجات کے لیے بارگاہ ایزدی میں دعاؤں کا اہتمام کیا گیا۔

۱۴ جنوری بروز ہفتہ ممتاز دانشور اور شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ کراچی کے ڈائریکٹر، سہ ماہی الصدیق کے مستقل مقالہ نگار جناب سید خالد جامعی مدظلہ کے والد گرامی جناب سید حسن الدین صاحب داعی اجل کو لبیک کہہ گئے، اللہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت اور پسماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائے امین

مولانا عبدالرؤف بادشاہ کی چچازاد بہن، جناب عبدالقدوس بادشاہ صاحب کی بہن اور مولانا عبدالبر بادشاہ کی اہلیہ رحلت فرما گئی اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان صبر جمیل سے نوازے۔

ختم بخاری

معہد الصدیق کے معاشی مسائل اور قرضوں کی ناگفتہ بہ حالت کی ازالہ کے لیے مسجد معہد الصدیق میں ختم بخاری شریف کا انعقاد کیا گیا، جس میں تمام اساتذہ کرام اور تمام طلبہ نے شرکت کی، اس موقع پر معہد کے نگران مولانا عبدالرؤف بادشاہ نے امت مسلمہ اور خصوصاً معہد کی ترقی اور معاشی بہتری کے لیے رقت آمیز دعا فرمائی۔

مبصر کے قلم سے

کتاب شناسی

مولانا سمیع الحق حیات وخدمات

مؤلف: مولانا عبدالقیوم حقانی.....ضخامت ۲ جلد

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ

حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی مدظلہ دینی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو موضوع کا حق ادا کرتے ہیں، آپ کا ایک خاص اسلوب نگارش ہے، قرطاس وقلم کی وادی میں آپ نے جس شخصیت کی برکت سے قدم رکھا، اس کتاب کے ذریعہ آج اسی عظیم اقلیم فکر ونظر کے شہسوار کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، حضرت حقانی صاحب کو اپنے استاد شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہ سے بے پناہ محبت ہے، اس کا ثبوت حقانی صاحب کی کتاب ''مولانا سمیع الحق حیات وخدمات'' ہے، جو استاد وشاگرد کے درمیان ربط وتعلق کی ایک لازوال داستان ہونے کے علاوہ ایک مرد مجاہد کی کہانی اور ایک عہد کی تاریخ بھی ہے۔

مولانا حقانی نے مولانا سمیع الحق صاحب کی داستان سبق آموز کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ مولانا سمیع الحق مدظلہ کی زندگی کے ہر گوشے سے بحث کی ہے، علم وقلم کے اعتبار سے ہو یا ادب وتاریخ کے لحاظ سے، درس وتدریس ہو یا اعلاء کلمۃ الحق، قومی وملی جدوجہد ہو یا سیاسی خدمات، فرق باطلہ کا رد ہو یا عالمی صلیبی اور صیہونی دہشت گردی کا تعاقب، نفاذ شریعت کی کوششیں ہو یا افغان جہاد اور دفاع پاکستان کو نسل کی خدمات.....غرض یہ کتاب مولانا سمیع الحق مدظلہ کی تقریباً پون صدی پر مشتمل داستان عزیمت کا ایک دلآویز مجموعہ ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا اسلوب سادہ وآسان ہے، اس میں کتنی ہی مقامات ایسے ہیں جہاں آپ کو رکنا پڑے گا، تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کرنی پڑیں گے اور اس تأثر کو دل میں اتارنا ہوگا جو آپ نے اس کتاب کے مطالعہ سے کشید کیا ہے، اس کتاب میں مولانا سمیع الحق مدظلہ کی صرف علمی، تدریسی اور سیاسی زندگی ہی بیان نہیں ہوئی بلکہ بعض خالص نجی واقعات بھی آگئے ہیں اور کسی کی عظمت جاننے کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ وہ نجی زندگی میں پاکباز ہو۔

کتاب کا اکثر مواد تاریخی اعتبار سے قابل لحاظ ہے، مؤلف اس نوع کی کتابیں لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں کثیر تعداد میں ان کے سوانحی مجموعے منظر عام کو معطر کر چکی ہے، اس کتاب پر تبصرہ لکھنا راقم جیسے نالائق اور کم فہم کے لیے نہایت مشکل ہے، اس کتاب پر تبصرہ لکھنے کے لیے تو علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مناظر احسن گیلانی، محترم ماہر القادری، جناب طالب ہاشمی، جناب حکیم محمد سعید اور شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی وغیرہم کا قلم چاہیے، احقر تو بس خریداران یوسف میں نام شامل کرنے کی غرض سے لکھتا ہے۔

ابکار الافکار فی اصول الاکفار المعروف اصو ل تکفیر

مؤلف:مفتی عبیدالرحمٰن.....ضخامت ۴۳۰صفحات

ناشر:مرکزالبحوث الاسلامیۃ مردان Mob:03133736809

عصر حاضر فتن، دجل، غفلت، ذہنی ارتداد اور ذہنی تخریب کاری کا دور ہے، ان فتنوں میں ایک بہت بڑا فتنہ، فتنہ تکفیر بھی ہے، دشمنان اسلام مسلمانوں کے درمیان پھوٹنے والے تمام فروعی اور اصولی اختلافات کے تفصیلی مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کی قوت کو باہم ٹکراؤ کے ذریعہ ختم کرنے کا طریقہ ان کے درمیان فرقہ وارانہ اختلافات کو بڑھا کر تکفیری سوچ اور فکر کو ہوا دینا ہے۔

دور حاضر میں مسئلہ تکفیر کے حوالے سے لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہیں، ہر مناظرے، مباحثے، مکالمے اور اختلاف رائے کا اختتام تکفیر پر ہوتا ہے، اس کی واضح مثال ہر فرقے کا دوسرے کو کافر وگمراہ قرار دیے جانے کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہے، اپنے اختراع کردہ اصولوں کی بنیاد پر زور وشور سے اپنے لوگوں کو دائرہ اسلام سے نکالنے کی مہم جاری ہے جس کے نتیجے میں شاید آج کوئی بھی ایسا نہ ہو جو ان کی زد سے باہر ہو، ہر گروہ نے اپنی اپنی رسی کو الگ تھاما ہوا ہے اور یہ زور اس قدر زیادہ ہے کہ اس خول سے جو شخص باہر نکلنا چاہے تو اسے دائرہ اسلام سے خارج تصور کیا جاتا ہے، اس موضوع پر ہر زمانہ میں اور ہر زبان میں ہر مسلک اور مکتبہ فکر کے علماء کرام اور اہل تحقیق نے بے شمار کتابیں تحریر فرمائی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ابکار الافکار فی اصول الاکفار المعروف اصول تکفیر بھی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، مفتی عبیدالرحمٰن صاحب نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر تمام اکابر واہل علم کے اقوال اور تحقیقات کی روشنی میں ایمان کی لغوی واصطلاحی تحقیق، اس کی ضروری شرائط، کفر کی لغوی واصطلاحی تعریف، اقسام واحکام، کفر وتکفیر کی شرائط، موانع اور اس بارے میں افراط وتفریط کی اصلاح، ضروریات دین کا مفصل تعارف اور تحقیقی وتطبیقی جائزہ، تکفیر کا جامع اور منضبط ضابطہ، استحال واستخفاف کی شرائط اور مختلف صورتیں، سیکولرازم کی تاریخ، اہداف اور شرعی حکم اور تکفیر کے لیے شرعی معیار کا تعین کیا اور ائمہ اہل سنت کے اقوال واعمال کی روشنی میں تکفیر کے شرائط وحدود منضبط کئے۔

مولانا مفتی عبیدالرحمٰن صاحب کی اس سے پہلے بھی کئی کتابیں اہل علم وفضل سے داد تحسین وصول پا چکی ہیں جن میں ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بنیادی اصول وضوابط'' اور ''مبیع کی کمی وزیادتی کا تحقیقی مطالعہ'' قابل ذکر ہیں، موصوف کی یہ وقیع علمی کاوش بھی اس پرفتن اور پرآشوب دور میں ہر گروہ، ہر فرقہ اور ہر مسلک سے تعلق رکھنے والوں کے لیے مشعل راہ اور ہر صاحب علم کے لیے چشم کشا، بصیرت افروز ثابت ہوگی، اللہ تعالیٰ موصوف کی اس کاوش کو نافع بنائے اور قبولیت عامہ سے نوازے۔

مذاہب اربعہ میں توہین رسالت اور توہین صحابہ کا تحقیقی جائزہ

مؤلف: مفتی ثناء اللہ ..... ضخامت: ۳۶۲ صفحات

ناشر: مرکز البحوث الاسلامیۃ مردان Mob:03133736809

سید الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وعقیدت ہر مسلمان کے ایمان کا بنیادی جزو ہے اور کسی بھی شخص کا ایمان اس وقت تک مکمل قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام رشتوں سے بڑھ کر محبوب ومقرب نہ جانا جائے، امت مسلمہ کا شروع دن سے ہی یہ عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے محبت وتعلق کے بغیر ایمان کا دعوی باطل اور غلط ہے۔

تاریخ کے کسی موڑ پر کسی بد بخت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کسی بھی قسم کی گستاخی کرنے کی کوشش کی تو مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے شتم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتکبین کو کیفر کردار تک پہنچایا، چند سال قبل ڈنمارک ناروے وغیرہ کے بعض آرٹسٹوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بارے میں خاکے بنا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑایا، جس سے پورا عالم اسلام مضطرب اور دل گرفتہ ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت ومحبت کے تقاضا کو سامنے رکھتے ہوا اہل ایمان سراپا احتجاج بن گئے اور قانون توہین رسالت کے اجراء کا مطالبہ کرنے لگے تو متجددین نے گستاخ رسول کی سزائے موت پر موجودہ قانون کو آزادی رائے کے خلاف قرار دیا اور اس دعوی کے ثبوت کے لیے علامہ ابن عابدینؒ کی کتاب تنبیہ الولاۃ والحکام علی أحکام شاتم خیر الانام کا سہارا لیا جانے لگا۔

زیر تبصرہ کتاب مذاہب اربعہ میں توہین رسالت اور توہین صحابہ کا تحقیقی جائزہ دراصل علامہ محمد ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالی کی اسی کتاب تنبیہ الولاۃ والحکام علی أحکام شاتم خیر الانام کا اردو زبان میں تشریحی اور تحقیقی ترجمہ ہے، مؤلف نے علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کے مؤقف کو علمائے کرام تک صحیح انداز میں پہنچانے کے لیے پہلے اصل کتاب مخطوطات کی روشنی میں تحقیق وتعلیق کے ساتھ پیش کر کے علمی حلقوں سے داد تحسین وصول کر لی، اب اردو دان طبقہ کے لیے اس کتاب کا دلنشین، سہل بامحاورہ تحقیقی اردو ترجمہ کیا تا کہ اردو خواں طبقہ کو بھی فقہائے احناف اور علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کا مؤقف معلوم ہو جائے۔

اس کتاب میں مؤلف نے گستاخ رسول کی سزا کے بارے میں ائمہ اربعہ کے مذاہب کا مدلل بیان، توہین انبیائے کرام علیہم السلام، توہین اہل بیت اور توہین صحابہ رضی اللہ عنہم کا حکم، متقدمین ومتاخرین حضرات فقہائے احناف کے آراء کا تجزیہ، گستاخ رسول کی سزا پر لکھی گئی عربی مطبوع ومخطوط کتب حنفیہ کا علامہ ابن عابدین کی رائے سے مقارنہ، عصر حاضر میں توہین رسالت کی سزا کے حوالے سے علامہ ابن عابدین کے مذہب سمجھنے میں بعض تسامحات کا ازالہ، گستاخ رسول کے بارے میں متجددین کی آراء کا تحقیقی جائزہ، ملکی وبین الاقوامی اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں گستاخ رسول کی سزا اور مذاہب عالم کی رو سے گستاخ رسول کا حکم ثابت کیا ہے۔

اور نا قابل تردید دلائل سے یورپ اور یورپ سے مرعوب ذہنیت کے اس غلط تاثر کو دور کیا گیا ہے کہ ''قانون توہین رسالت، بنیادی حقوق انسانی کے منافی ہے'' بلکہ پرزور استدلال سے اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ یہ قانون انسانی عظمت وتکریم کے لئے فی الحقیقت ضروری ہے جو اقوام متحدہ کی حقوق انسانی چارٹر کا ایک نہایت اہم شق ہے۔

کتاب کی ظاہری خوبیاں بھی دل آویز ہیں، سرورق بہت ہی دلکش اور جاذبِ نظر ہے، ان کے علاوہ علم ودانش کے خوشہ چین حضرات کے لئے بھی اس میں معارف اور بصائر کے خزینے موجود ہیں اور ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ ایمان افروز ہوگا، غیر مسلم بھی اگر حقیقت پسندی سے اس کا مطالعہ کریں تو قانون توہین رسالت کے بارے میں ان کی غلط فہمیاں دور ہوں گی، اس کتاب کو ہر لائبریری کی زینت ہونا چاہیے، یونیورسٹی اور کالج کے طلباء، سیاست داں، سفارت کار، دانشور، اربابِ صحافت اور تمام مکاتبِ فکر کے اصحاب کے لئے یہ ایک لائق مطالعہ کتاب ہے۔

تابش طیبہ

مرتب: محمد رمضان میمن..... ضخامت: ۸۰ صفحات

ناشر: جہان نعت شارع مسجد حدیبیہ گلشن حدید فیز ۲ بن قاسم ضلع ملیر کراچی

نعت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ بہت پرانی ہے اگر کہا جائے کہ دنیا کا وجود میں آنے سے بھی پرانی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا، ہر دور میں عشق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار علماء کرام اور ادباء عظام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں عقیدت اور محبت کے پھول پیش کیے، اور تا قیام قیامت پیش کرتے رہیں گے، ان حضرات میں ایک روشن نام گرامی جناب مسرور کیفی مرحوم کا بھی ہے، جنہوں نے بہت سارے نعتیہ مجموعے تیار کیے، جن کی مطبوعہ مجموعوں کی تعداد تقریباً ۲۲ ہیں اور چند مجموعے مخطوطہ شکل میں بھی موجود ہے۔

زیر تبصرہ مجموعہ تابش طیبہ بھی ایک نعتیہ انتخاب ہے جس کے مرتب حاجی محمد رمضان میمن صاحب ہے، موصوف مرتب جناب مسرور کیفی مرحوم کے برادر خورد اور ایک دیندار انسان ہیں، نعت شریف سے موصوف کی رغبت اور دلچسپی کسی تعارف کی محتاج نہیں، نعتیہ ادب کے حوالے سے ان کی خدمات قابل تعریف ہے، مرتب موصوف کا یہ مجموعہ یقیناً ان کے ذوق انتخاب کا آئینہ دار ہے مرتب کے چناؤ اور انتخاب قابل صد لائق تحسین ہے یہ مجموعہ عشاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہترین توشہ اور ایک قیمتی سوغات سے کم نہیں۔

اللہ تعالیٰ مسرور کیفی مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور مرتب موصوف کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بلند پایہ نعتوں سے مزین نعتیہ انتخاب کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے۔